درسہائے

نہج البلاغہ

تالیف

سیّد سجّاد رضوی

امامیہ پبلیکیشنز پاکستان

درسہائے

نہج البلاغہ

تالیف :

سید سجّاد رِضوی

ناشر :

امامیہ پبلیکیشنز

۱۷۔ نور چیمبر۔ گنپت روڈ — لاہور

فون : ۳۲۵۱۵۴

کتاب ــــــــــــــــ درس ہائے نہج البلاغہ

مصنف ــــــــــــــــ پروفیسر سیّد سجاد رضوی

ناشر ــــــــــــــــ امامیہ پبلیکیشنز

مطبع ــــــــــــــــ اظہار سنز پرنٹرز

تاریخ اشاعت ــــــــــــــــ اپریل ۱۹۸۵ء

کتابت ــــــــــــــــ حافظ عبدالرشید

ہدیہ ــــــــــــــــ -/۱۲ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللهم صل على محمد وآل محمد

فہرست

عرضِ ناشر	۹
خودشناسی	۱۱
مجلسی زندگی	۱۳
امید و عمل	۱۷
ایمان اور یقین	۲۱
علم و حکمت	۲۵
علم و معرفت	۲۷
حصولِ علم	۳۱
علم اور معاشرہ	۳۵
دین کی اوّلین منزل	۳۹
اسلامی عبادات	۴۱
حقوق العباد	۴۵
حضرت علی علیہ السلام اور غیر جانبداری	۴۷
دنیا اور آخرت میں توازن	۵۱
زہد	۵۵
زہد کی تعریف	۵۷
دوستی کی اہمیت	۵۹
غنی کون ہے	۶۳
عدل (۱)	۶۷
عدل (۲)	۷۱
بہترین عدل	۷۳
تغیّر کی اہمیت	۷۷
عقل کا استعمال	۸۱
بے جا خاموشی	۸۵
پُرخوری	۸۷
ہوسِ زر	۹۱
طمع	۹۵
ظلم	۹۷
فقر کا سدِباب	۱۰۱

بُخل	۱۰۵	جہاد (۱)	۱۲۳
بُخل برائیوں کی جڑ	۱۰۷	جہاد (۲)	۱۲۶
ذخیرہ اندوزی	۱۱۱	صلح و جنگ	۱۲۸
شدید ترین گناہ	۱۱۵	موت کی حقیقت	۱۳۱
جانوروں کے ساتھ سلوک	۱۱۷	سفرِ آخرت	۱۳۴
حاکم کے فرائض	۱۲۱	ۂ	

عرضِ ناشر

نہج البلاغہ کو دینی ادب میں جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی صاحبِ نظر کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔ اسلام کے فلسفیٔ اوّل علی علیہ السلام کے ارشادات و فرمودات آج تک اہلِ علم و فضل کے لیے مرکزِ کشش رہے ہیں۔ ہر دور میں علماء اور اہلِ دانش نے ان میں غوّاصی کر کے حقیقت و معرفت کے موتی تلاش کئے اور اپنے جیب و دامان کو ان موتیوں سے مالا مال کیا ہے۔

ہمارے دور کے معروف و ممتاز دانشور پروفیسر سید سجاد رضوی نے زیرِ نظر کتاب میں انہی حقائق و معارف کے کچھ رازوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ وہ بحرِ علم و عرفان کی شناوری کر کے ہمارے لیے کچھ گہرہائے آبدار لائے ہیں۔ اس مختصر سی کتاب میں وہ بہت کچھ ہے جو آپ اپنی تسکینِ قلب و نظر کے لیے چاہتے ہیں۔

مولائے متقین امیر المومنین علیہ السلام کی تعلیمات ہم فخر و انبساط سے پیش کرتے ہیں اور آپ سے یہ توقع بھی کرتے ہیں کہ انہیں اپنے لیے مشعلِ راہ بنائیں گے۔

(ادارہ)

خودشناسی

نہج البلاغہ کے خطبات اور مکاتیب میں جناب امیر علیہ السلام نے ہمیں تعلیمات اسلامی کی وہ تفسیر پیش کی ہے جس کو سامنے رکھ کر ہم ایک مسلمان کی حیثیت سے کامیاب زندگی گذارنے پر قادر ہو سکتے ہیں۔ اسلام میں اور دوسرے ادیان میں جو فرق ہے اُن میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اسلام انسان کو اپنی نفی کرنے پر آمادہ نہیں کرتا بلکہ اسے اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ وہ اپنی ذات کے تمام امکانات کو پوری طرح اجاگر کرے اور انہیں احکام الٰہیہ کے مطابق کام میں لائے۔ دوسرے ادیان میں انسان کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ختم کر دے۔ اپنی ذات کی نفی کرے، اپنے نفس کو مارے اور دُنیا کو ترک کر دے۔

اس موضوع پر جناب امیر علیہ السلام کا ارشاد ہے:۔

"ھلک امرؤ لم یعرف قدرہٗ"

"یعنی جس شخص نے اپنی قدر و قیمت نہ پہچانی وہ ہلاک ہو گیا۔"

یہاں ہلاک ہونے کے معنی مر جانے کے نہیں ہیں بلکہ اپنے آپ کو برباد کرنے کے ہیں۔ اور اپنی منزل سے دُور ہونے کے ہیں۔ خودشناسی یا اقبال کے الفاظ میں خودی کی پہچان انسان کے لیے بیحد ضروری ہے کیونکہ اگر کوئی شخص یہ نہ جانتا ہے کہ خداوند عالم نے اسے کیا کچھ عطا فرمایا ہے اور اسے کن کن قابلیتوں سے نوازا ہے تو وہ اس قابل ہو ہی نہیں سکتا۔ کہ وہ اپنی زندگی میں ان قابلیتوں سے استفادہ کرے اور اپنے معاشرہ کو اس سے فائدہ پہنچائے۔ لہذا ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ ہمارے اندر کون کون سی قابلیتیں ہیں۔ اس کے بعد کا مرحلہ ان قابلیتوں کو استعمال کرنے کا ہے لیکن اگر ہم اپنی قابلیتوں کو نہ پہچانیں تو یہ ایک طرح سے کفرانِ نعمت ہے کہ خداوند عالم نے ہمیں ایک چیز عطا فرمائی اور ہم نے اسے پہچانتے اور اسے کام میں لانے کی

لانے کی کوشش ہی نہ کی۔ ظاہر ہے کہ اس کفرانِ نعمت کے لیے ہم جوابدہ ہوں گے۔

جب انسان اپنے اندر پوشیدہ قابلیتوں کا درس حاصل کر لیتا ہے لیکن انہیں استعمال نہیں کرتا تو بھی یہ کفرانِ نعمت ہی کی ایک شکل ہے بلکہ پہلے کے مقابلہ میں بڑا گناہ ہے کیونکہ پہلے شخص نے جو اپنی قابلیتوں کو جانا ہی نہیں اور اس لاعلمی کی وجہ سے ان کو استعمال نہیں کیا۔ لیکن دوسرے شخص نے اپنی قابلیتوں کا علم حاصل کرنے کے باوصف انہیں استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ دونوں صورتیں کفرانِ نعمت کی دو شکلیں ہیں۔ اس کے مقابلے میں جب ہم اپنی قابلیتوں کو جاننے کی کوشش کریں اور انہیں دریافت کر کے احکامِ الٰہی کے مطابق انہیں صرف کریں، تو نہ صرف اس سے ہمیں اور ہمارے معاشرے کو فائدہ حاصل ہوگا بلکہ یوں ہم تحدیث نعمت پر ادائے شکر کے مرحلے سے بھی گذریں گے اور ہماری زندگی ایک کامیاب زندگی ہوگی۔

اسی مطلب کو جناب امیر المؤمنین علیہ السّلام نے ایک مقام پر یوں ظاہر کیا ہے کہ "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا۔ اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔" دوسرے لفظوں میں جب انسان اپنے نفس اور اس میں پوشیدہ جواہر کو پہچان لیتا ہے اور انہیں استعمال کرتا ہے تو اسے اس ذات کی پہچان بھی حاصل ہو جاتی ہے جس ذات نے اسے ان قابلیتوں اور طاقتوں سے نوازا ہے ان دونوں اقوال میں ایک بات مشترک ہے۔ کہ جناب امیر علیہ السّلام نے ان میں 'عرف' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ 'علم' کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اگر 'علم' کا لفظ استعمال کیا ہوتا تو اس سے مُراد صرف جاننا ہوتی۔ لیکن لفظ 'عرف' کے استعمال سے جناب امیر علیہ السّلام اس طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ 'عرف' جاننا کافی نہیں بلکہ اس علم کو عمل کی شکل دینا بھی ضروری ہے۔ علم و عمل کے اس اجتماع ہی سے ہم انفرادی اور اجتماعی فوائد بھی حاصل کرتے ہیں اور خداوندِ عالم کی خوشنودی بھی۔

مجلسی زندگی

اسلام کی بعض امتیازی خصوصیات ایسی ہیں جو اسے دیگر ادیان و مذاہب سے بالکل جداگانہ حیثیت دے دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ دین کی وہ تعریفیں جو غیر مسلم اہلِ فکر نے کی ہیں، اسلام پر صادق نہیں آتیں کیونکہ ان تمام تعریفوں کی اساس یہ ہے کہ دین بندے کو دنیا سے بیگانہ کر کے اپنے پالنے والے اور خالق سے ملا دیتا ہے لیکن اسلام ان تمام ادیان کے برخلاف بندے کو خدا سے ملاتا ہے لیکن اسے ترکِ دنیا کی دعوت نہیں دیتا۔ بلکہ اس سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ دنیا میں یوں رہے کہ خدا سے بیگانہ نہ ہو۔ دین و دنیا میں ہم آہنگی اسلام کی ان امتیازی خصوصیات میں سے ہے جو اسے دیگر مذاہب سے ممیز کر دیتی ہیں۔ اسلام میں انسان کو ایک صالح معاشرہ تعمیر کرنے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ اسی لیے تمام اسلامی عبادات اجتماعی رنگ لیے ہوتے ہیں۔ ان میں فرد اپنی انفرادیت کو اجتماع میں ضم کر دیتا ہے۔

معاشرے میں رہنے کے آداب کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیشمار احادیث موجود ہیں۔ ان احادیث میں ایک مسلمان کو اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ مل جل کر رہنے اور ان کے دکھ درد میں شریک ہونے کا سبق دیا گیا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام بھی کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت سے بچپن ہی سے فیض یاب رہے، سنّتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شارح کی حیثیت سے فرد کو معاشرے میں رہنے کے آداب کے بارے میں مختلف مواقع پر درس دیتے ہیں۔ آج کی صحبت میں اسی موضوع پر حضرت علی علیہ السلام کا ایک قول سامعین کے گوش گذار کیا جاتا ہے فرماتے ہیں:

خالِطوا الناس مخالطۃً اِن متّم معھا بکوا علیکم وان عشتم حنوا الیکم۔ یعنی لوگوں کے ساتھ یوں میل جول رکھو کہ اگر ان کے درمیان وفات پا جاؤ تو وہ تمہارے لیے گریاں ہوں اور اگر زندہ رہو تو وہ تمہارے مشتاق و والہ و شیدا ہوں۔

اس قول میں نہ صرف فرد کو آداب معاشرت کا سبق دیا گیا ہے بلکہ معاشرتی رشتوں کی اساس کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے ہر فرد بشر جبلی طور پر خواہشات رکھتا ہے۔ لیکن جو بات اسے جانوروں سے جُدا کر دیتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض اوقات جائز خواہشات کو اس لیے قربان کر دیتا ہے کہ دوسروں کی خواہشات پوری ہوں۔ اس کو دوسرے لفظوں میں ایثار کہتے ہیں اگر ہر انسان یہ کوشش کرے کہ اس کی تمام خواہشات پوری ہو جائیں تو پھر معاشرہ برقرار نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اس صورت میں طاقت ور کمزور افراد کے حقوق غصب کر کے اپنا گھر بھر لیں گے اور عمل در دِعمل کا سلسلہ معاشرتی تار و پود کو بکھیر دے گا۔ اس لیے ہر معاشرے نے افراد کے لیے کچھ اصول وضع کئے ہوتے ہیں تاکہ ہر فرد کے حقوق کی حفاظت ہو سکے اور کسی کو کوئی رنج نہ پہنچے۔ مثال کے طور پر جن علاقوں میں انتقام لینے کا رواج ہوتا ہے، اور افراد قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں وہاں ایک دوسرے کو مارنے کا سلسلہ معاشرے کے بندھن توڑ دیتا ہے اور افراد ایک دوسرے سے خائف نظر آتے ہیں۔ اسی لیئے ہر حکومت کی کوشش ہوتی ہے کہ افراد کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے سے روکے اور جس فرد کے حقوق غصب ہوئے ہوں اسے وہ حقوق دلائے، افراد کے مابین محبّت والفت کے رشتے استوار کرے کیونکہ اس کے بغیر معاشرہ پھل پھول نہیں سکتا۔

جناب امیر علیہ السّلام کا یہ ارشاد کہ اگر تم مر جاؤ تو لوگ تم پر گریاں ہوں، بنیادی طور پر اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ ہم اپنے معاشرے کے دیگر افراد سے ایسا سلوک روا رکھیں کہ انھیں ہماری ضرورت محسوس ہو۔ اگر کسی شخص کو ہماری ضرورت ہی نہ ہو تو اسے ہماری موت پر غم کیونکر ہو گا چونکہ انسان فطری طور پر مطلبی ہے۔ اس لیے اسے کسی شخص کے مرنے کا غم صرف اس وقت ہوتا ہے جب اسے اس کے فقدان کا احساس ہو یہ بات صرف اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ہم اپنے ابنائے جنس کے لیے مفید ثابت ہوں اور انہیں ہماری افادیت کا احساس ہو اور یہ جذبہ اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے، جب ہم اپنے ساتھیوں کے لیے ایثار کو اپنائیں اور اپنی جائز ضروریات بھی ان کے لیے قربان کر دیں۔ اسی صورت میں انھیں ہمارے مرنے کا غم اور اسی صورت میں وہ ہماری زندگی

کے لیے دعائیں مانگیں گے اور ہمارے وجود کے مشتاق ہوں گے۔ یہی بات اس قول کے دوسرے حصے میں کی گئی ہے۔ ظاہر ہے اگر ہم لوگوں سے اچھا سلوک روا نہ رکھیں تو وہ ہمارے نزدیک بھی نہ پھٹکیں گے۔ ہمارے لیے ان کے دل میں قدر و قیمت کیوں پیدا ہوگی۔

گویا اس قول میں جناب امیر علیہ السلام نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث کو بانداز دیگر پیش کیا جس میں ارشاد نبوی ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان سلامت رہیں۔ اور یہی تعلیم قرآن مجید میں دی گئی ہے۔ کہ سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ خدا ہمیں اس برادرانہ جذبے سے سرشار فرمائے اور ہم متحد ہو کر ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکیں۔

امید و عمل

جناب امیر علیہ السلام کا ایک قول بڑی معنی خیز اہمیت کا حامل ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ مَن جَرَی فِی عِنَانِ اَمَلِہٖ عَثَرَ بِاَجَلِہٖ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ جو شخص اپنی امیدوں کی لگام چھوڑ دیتا ہے وہ اپنی موت سے جا ٹکراتا ہے۔ اُمید انسانی ضرورت ہے۔ لیکن صرف امید بے عملی اور جمود تک لے جاتی ہے۔

ہر معاشرے میں مختلف طبیعتوں کے لوگ بستے ہیں بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی نگاہیں صرف سامنے چیز پر پڑتی ہیں اور بعض ایسے جو سامنے کی چیز کو خاطر میں نہیں لاتے بلکہ ان کی نگاہیں ان سے پرے کہیں اور کچھ تلاش کر رہی ہوتی ہیں۔ ایک گروہ کو عرف عام میں حقیقت پسند کہا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک حال ہی اصل ہے انھیں مستقبل اپنی جانب متوجہ ہی نہیں کرتا۔ دوسرے گروہ کو خیالی کہا جاتا ہے وہ حال سے آنکھیں بند کر کے صرف مستقبل پر نگاہیں جمائے بیٹھے رہتے ہیں اور پھر ان دونوں گروہوں کے مابین اور گروہ ہوتے ہیں جن میں حقیقت پسندی اور خیالیت کی مختلف آمیزشیں ہوتی ہیں۔ حقیقت پسند اور خیالی گروہ دونوں افراط و تفریط کا شکار ہوتے ہیں۔ اگر ہم صرف سامنے کی چیزوں پر نگاہیں جما دیں اور حال ہی میں مست ہو جائیں تو جمود کا شکار ہو جائیں گے۔ کیونکہ ترقی کی حرکت مستقبل کے خواب دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان ان خوابوں کو حقیقت بنانے کی کوشش کرتا ہے اور یوں خوب سے خوب تر تک کا سفر جاری رہتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر صرف خواب دیکھتا رہے اور ان خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش نہ کرے یا پھر ایسے خواب دیکھتا رہے جن کو عملی شکل دینا ہی ممکن نہ ہو تو وہ زندگی میں کچھ حاصل ہی نہ کر پائے گا۔ حد سے زیادہ رجائیت اور مستقبل کے سنہرے خواب دیکھنا بالآخر انسان کو مایوسی سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ جب اس کی آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھیں اور وہ حقیقت

حال سے آگاہ ہو تو اسے پتا چلتا ہے کہ وہ اندھیرے میں بھٹکتا رہا ہے۔ یہ دونوں صورتیں انسانی زندگی اور معاشرے کے لیے مضر ہیں۔

جناب امیر علیہ السلام کے اس قول میں اس گروہ کا ذکر ہے جو امیدوں کے ہجوم میں گم ہو جاتا ہے اور حقیقت سے اپنا ناطہ توڑ لیتا ہے ایسا گروہ خیالی پلاؤ پکاتا رہتا ہے اور کرتا کچھ نہیں۔ گویا بے عملی اسے اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ یہ لوگ زندگی میں کچھ حاصل نہیں کر پاتے یہاں تک کہ انہیں موت آن دبوچتی ہے۔ آپ کے قول کا ایک مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ بالآخر ان کی امیدوں کی موت واقع ہو جاتی ہے اور وہ لوگ مایوسی کے غاروں میں گم ہو جاتے ہیں۔

اسلام کہ انسان کو صحیح طریقے پر زندگی گذارنے کی تلقین کرتا ہے ان دونوں رویوں کی نفی کرتا ہے وہ اپنے ماننے والوں کو حقیقت پر نگاہ رکھنے کے لیے بھی کہتا ہے اور اس کے ساتھ امید کا سہارا لینے پر بھی آمادہ کرتا ہے۔ خیالی امید پر زندگی بسر کرنا جیسے بعض لوگ تو توکل سمجھ بیٹھتے ہیں اسلامی طریقہ نہیں قرآن مجید میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ کافروں کے مقابلے کی تیاری کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ۔ یعنی ان کفار کے مقابلے کے لیے جہاں تک تم سے ہو سکے اپنی قوت سے اور بندھے ہوئے گھوڑوں سے تیاری کرو۔ اس سے خدا دشمن اور اپنے دشمن اور اس کے علاوہ دوسروں پر بھی اپنی دھاک بٹھا لوگے جنہیں تم نہیں جانتے۔ اس آیہ مبارکہ سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ خداوند عالم مسلمانوں کو حقیقت پر نگاہیں جما کر مستقبل کے لیے تیار رہنے کا حکم دیتا ہے مسلمانوں سے یہ نہیں کہا گیا کہ وہ صرف اس امید پر بیٹھے رہیں کہ خدا اپنے بندوں کی مدد کرے گا۔

ایک اور آیت میں ارشاد الٰہی ہے کہ: لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۔ وہی کچھ حاصل کرتا ہے جس کے لیے وہ تگ و دو کرے؛ اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ تلقین بھی کی گئی کہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۔ یعنی خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہونا۔

کامیاب زندگی کا طریقہ یہی ہے کہ انسان حقیقت سے آنکھیں نہ چرائے اور امّید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ لیکن اگر انسان صرف امید ہی کا سہارا لے اور تگ و دو کو ترک کردے تو وہ ہلاکت کا ہدف بن جاتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس بات کو نہایت خوبصورت استعارے میں بیان فرمایا ہے۔ امید کے سہارے جینے والوں کو اس شخص کے مشابہ قرار دیا ہے جو گھوڑے پر بیٹھا ہو اور باگیں چھوڑ دے۔ گھوڑا آزادی پاکر اُٹھ دوڑے گا اور بالآخر اس شخص کو کہیں نہ کہیں گرا کے موت کے منہ میں ڈال دیگا۔ اس قول میں امید کو منہ زور گھوڑا تصور کیا گیا ہے جو اپنے سوار کو اڑا لے جاتا ہے اور اسے اپنے ماحول سے اپنی منزل سے اور مقصد سے بیگانہ کرکے برق رفتاری کے جادو کے زیر اثر لے آتا ہے اور یوں آخر کار اسے نقصان پہنچاتا ہے۔ انسان پہ لازم ہے کہ اُمّید کے گھوڑے پر سوار تو ضرور ہو لیکن باگوں پہ ہاتھ رکھے۔

ایمان اور یقین

جنابِ امیر علیہ السلام سے ایک شخص نے دریافت کیا: کَمْ بَیْنَ الْاِیْمَانِ وَالْیَقِیْنِ یعنی ایمان اور یقین کے درمیان کتنا فاصلہ ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا: اَرْبَعُ اَصَابِعَ، یعنی چار انگل کا۔ ان سے پوچھا گیا کہ اس کا مطلب کیا ہوا؟ تو جنابِ امیر علیہ السلام نے فرمایا اَلْاِیْمَانُ کُلُّ مَا سَمِعَتْهُ اُذُنَاكَ وَصَدَّقَهُ قَلْبُكَ وَالْیَقِیْنُ مَا رَأَتْهُ عَیْنَاكَ وَاَیْقَنَ بِهٖ قَلْبُكَ وَلَیْسَ بَیْنَ الْعَیْنِ وَالْاُذُنِ اِلَّا اَرْبَعُ اَصَابِعَ۔ یعنی جو کچھ تم نے سنا اور تمہارے دل نے اس کی تصدیق کی وہ ایمان ہے اور جو کچھ تمہاری آنکھیں دیکھیں اور تمہارا دل اسے مان لے وہ یقین ہے اور آنکھ اور کان کے مابین چار اُنگل سے زاید فاصلہ نہیں۔

اس قول پر غور کریں تو ایمان اور یقین کے مابین جو فرق ہے وہ اس سے زیادہ واضح اور بیّن انداز میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس قول کے مطابق ایمان کا تعلق دل کی تصدیق سے ہے یعنی ہمارا دل یہ کہے کہ جو بات کہی گئی ہے وہ سچ ہے۔ اس تصدیق میں دلیل کا کوئی دخل نہیں ہمارے تجربے میں یہ بات اکثر آتی ہے کہ ہم سنی سنائی باتوں کی تصدیق بعض اوقات کہنے والے کی شخصیت یا ماحول کے زیرِ اثر کر دیتے ہیں اور دل سے کرتے ہیں لیکن ہمارے لاشعور میں کوئی بات مسلسل ان باتوں کے خلاف ہمیں شکوک و شبہات کا شکار بنائے رکھتی ہے جوں ہی وہ اثرات غائب ہوں جن کے تحت ہم نے سنی ہوئی باتوں کی تصدیق کی تھی۔ ہمارا دل امور کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ پھر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض اوقات ہم کسی خبر کو مان تو لیتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارے دل میں کرید ہوتی رہتی ہے کہ آخر یہ بات ممکن کیونکر ہے۔ جب روس نے اور اس کے بعد امریکا نے چاند پر انسانوں کو بھیجا اور انہوں نے وہاں کی خبریں اہلِ زمین کو سنائیں تو بے شمار لوگ ایسے تھے جنہوں نے اس خبر کی تصدیق تو کی کیونکہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا لیکن اس کی صحت کے بارے میں شکوک و شبہات انہیں گھیرے رہے۔ انہوں نے خبر مان تو لی لیکن اس کے

باوجود انہیں یقین نہیں تھا کہ ایسا ہوا ہے لیکن وہ اشخاص جو چاند پر گئے ان پر یہ بات صادق نہیں آتی۔ انہوں نے چاند پر جاکر اور چاند کو دیکھ کر خود یقین کی منزل طے کرلی ہے۔ اب ان کے اس یقین کو دنیا کی کوئی طاقت شکوک کی زد میں نہیں لاسکتی۔

جو باتیں براہ راست انسانی تجربے میں آئیں ان کا اثر دیرپا ہوتا ہے اور ان کے بارے میں انسان شک میں مبتلا نہیں ہوتا لیکن یہ بات ممکن ہے کہ انسان اپنے تجربہ سے غلط نتائج اخذ کرنے یا ان نتائج کی تطبیق غلط طور پر کرے۔ مثال کے طور پر ایک انسان دور سے دھواں اٹھتا ہوا دیکھے اور اس کا تجربہ اسے یہ بتاتا ہو کہ دھواں آگ لگنے سے پیدا ہوتا ہے اس لیے وہ نتیجہ یہ نکالے کہ کہیں آگ لگی ہوئی ہے لیکن امکان اس بات کا بھی ہے کہ وہ آگ خود بخود نہ لگی ہو بلکہ کسی شخص نے کوئی فائدہ حاصل کرنے کے لیے لگائی ہو۔ اس صورت میں اگر دھواں دیکھنے والا فائر بریگیڈ کو اطلاع دے دے تو ہم یہ کہیں گے کہ اس نے اپنے تجربے کے نتائج کو غلط استعمال کیا۔ اس بات کو تسلیم کرنے کے باوصف بھی یہ بات اپنے مقام پر درست ہے اور کوئی شخص بھی اس کے اس یقین کو شک میں تبدیل نہیں کرسکتا کہ آگ لگنے سے دھواں پیدا ہوتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں جو بات ہمارے اپنے تجربے میں آجائے وہ سنی سنائی بات کے مقابلے میں کہیں زیادہ یقین پیدا کرتی ہے۔ جناب امیر علیہ السلام نے اپنے اس قول میں ایمان اور یقین کے اس فرق کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ اگر وہ بات جس پر ہمارا ایمان ہے یقین میں تبدیل ہوجائے تو وہ پختہ ہوجاتی ہے۔ وجود باری تعالیٰ پر ہمارا ایمان ہے اور ہم خدا کو ہمہ وقت اپنا نگران مانتے ہیں لیکن اس کے باوجود زندگی میں بیسیوں کام ایسے کرتے ہیں جو ہمارے ایمان کی نفی کرتے ہیں۔ لیکن اگر وجود خدا ہمارے ذاتی واردات پر اثر انداز ہو تو ہم اپنے ایمان کو یقین کی صورت دے دیں تو پھر ناممکن ہوگا کہ ہم زندگی میں کوئی ایسا کام کریں جو اس بات کو ظاہر کرے کہ ہم نے وجود خدا کو فراموش کیا ہے۔

جنگ احد میں جب مسلمان میدان سے فرار کرگئے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ میدان میں باقی رہے تو حضرت علی علیہ السلام اپنی ذوالفقار

کے جوہر دکھاتے رہے۔ جنگ کے خاتمے پر جناب ختمی المرتبت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے پوچھا کہ یا علی! تم میدان چھوڑنے پر آمادہ کیوں نہ ہوئے۔ تو حضرت علی علیہ السلام نے جواب میں ارشاد فرمایا۔ کہ هَلِ الْكُفْرُ بَعْدَ الْإِيمَانِ یعنی کیا ایمان کے بعد کفر ممکن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ اگر ایمان کامل ہو، یعنی یقین کے درجے پر پہنچ جائے تو پھر کفر کا ارتکاب ناممکن ہے۔ اب وہ مسلمان جو جنگِ اُحد میں فرار کر گئے تھے اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کے ایمان نے یقین کا درجہ حاصل نہیں کیا تھا ورنہ یہ جانتے ہوئے کہ شہید ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور خداوند عالم کا وعدہ ہمیشہ پورا ہوتا ہے وہ میدان چھوڑ کر جان بچانے کی فکر نہ کرتے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بھاگنے والے اپنے ایمان میں کمزور تھے اور انہیں اس بات میں شک تھا کہ جام شہادت پی کر وہ حیاتِ جاوید حاصل کر لیں گے۔

اسی طرح قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ مذکور ہے کہ انہوں نے خداوند عالم سے درخواست کی کہ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ یعنی مجھے دکھا کہ تو مُردوں کو زندہ کیسے کرتا ہے اور خداوندِ عالم کے اس سوال کے جواب میں أَوَلَمْ تُؤْمِنْ (کیا تو ایمان نہیں رکھتا) حضرت ابراہیم علیہ السلام بارگاہِ ایزدی میں عرض کرتے ہیں کہ ایمان تو ہے لیکن اس لیے مُردوں کا زندہ ہونا دیکھنا چاہتا ہوں کہ دل کو اطمینان ہو جائے۔ اس واقعہ سے بھی حضرت علی علیہ السلام کے اس قول کو سند ملتی ہے کہ سنی سنائی بات پر ایمان لانے کے باوجود اطمینان قلب اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ بات انسانی تجربے اور واردات کا جزو بن جائے۔ مومن کا سفر ایمان سے شروع ہوتا ہے اور حق الیقین کی منزل پر ختم ہوتا ہے اور اس منزل پر پہنچ کر مومن کو کوئی طاقت اپنی راہ سے ہٹا نہیں سکتی۔ اسی قسم کے مومنین پر قرآن مجید کی اس آیت کا اطلاق ہوتا ہے، إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْقَاعِدِينَ - الغاوین

یعنی بے شک میرے بندوں پر تجھے کوئی تسلّط حاصل نہیں سوائے ان کے جو گمراہ ہو کر تیری پیروی کرتے ہیں۔

علم و حکمت

جناب امیرالمومنین علیہ السلام کی زندگی کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کے نزدیک اقدار زندگی میں سب سے اہم قدر علم و حکمت ہے۔ ان کے خطبات اور مکاتیب میں بار بار علم و حکمت کی اہمیّت پر زور دیا گیا۔ حضرت علی علیہ السّلام کے دوسرے اعمال کی طرح ہر عمل بھی سنّتِ نبوی اور تعلیماتِ اسلامی کی آئینہ داری کرتا ہے۔ کیونکہ اسلام میں افضل سمجھنے کا معیار زیادہ متقی ہونا ہے اور تقویٰ کے حصول کے لیے عدل ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ عدل اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک علم نہ ہو۔ اور بھی ایسا جو عمل کی شکل اختیار کر چکا ہو۔ اسی لیے سرکارِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم کا حصول سب مسلم مردوں اور عورتوں پر فرض کیا ہے آج کی اس گفتگو میں جناب امیر کا ایک قول اسی موضوع پر چنا گیا۔

جناب امیر علیہ السّلام فرماتے ہیں:

"خذ الحکمة انی کانت - فان الحکمة تکون فی صدرِ المنافق فتلجلجُ فی صدره حتیٰ تخرج فتسکن الیٰ صواحبها فی صدرِ المومن۔"

اس قول کا مطلب یہ ہے کہ حکمت و دانائی جہاں کہیں سے ملے لو۔ یہ حکمت منافق کے سینے میں ہو تو بے قرار رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہاں سے نکل کر مومن کے دل میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا بیٹھتی ہے۔ اس قول میں پہلی بات جو واضح طور پر سامنے آتی ہے یہ ہے کہ حکمت و دانائی کے حصول میں کسی قسم کے تعصب سے کام نہیں لینا چاہیئے اگر دشمن سے بھی حکمت ملے تو انسان کو اسے حاصل کر لینا چاہیئے۔ ایک مشہور فلسفی سے لوگوں نے پوچھا تھا کہ تم نے دانائی کہاں سے حاصل کی تو اس نے جواب دیا "احمقوں سے" جب لوگوں نے پوچھا وہ کیونکر تو اس نے جواب دیا کہ جو کام وہ کرتے تھے میں انہیں ترک کر دیا کرتا تھا۔ اگر ہم

علم وحکمت کے حصول میں تعصب سے کام لیں تو پھر بیشمار باتیں ایسی ہوں گی جنہیں ہم اس لیے اختیار نہیں کریں گے کہ اس کا کہنے والا ہمیں پسند نہیں اور یوں ہم اس علم وحکمت سے محروم ہو جائیں گے۔ ایک اور مشہور قول اسی مطلب کا یہ ہے کہ

"انظر الیٰ ما قال و تنظر الیٰ من قال" یعنی تو یہ دیکھ کہ کوئی شخص کہتا کیا ہے۔ یہ مت دیکھ کہ کہنے والا کون ہے۔

لہٰذا علم وحکمت کے حصول میں نہ تو انسان کو تعصبات سے کام لینا چاہیئے اور اس میں شرم برتنا چاہیئے۔

یہ تو اس قول کے ظاہری معنی تھے اس قول پہ مزید غور کریں۔ ایک اور بات سامنے آتی ہے کہ مومن کا دل تو حکمت کا خزانہ ہے لہٰذا اگر کوئی شخص علم وحکمت سے دور ہو تو اس کے ایمان کی کمی کا سراغ ملتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں حکمت سے بے بہرہ ہونا منافق کی علامت بھی ہے۔

اسلام نے اور اسلام کے پھیلانے والوں نے اپنے عمل سے اسلام کی اس اساسی قدر کا اظہار کیا ہے اور دنیا کو علم وحکمت کا سبق دیا اگر مسلمانوں نے یونانی اور ایرانی فلسفے کو حاصل نہ کیا ہوتا اور اس میں اضافے نہ کئے ہوتے تو آج دنیا کی سائنسی ترقی یہ صورت اختیار نہ کر جاتی۔ اس علم وحکمت کے سلسلہ میں اسلام کا وطیرہ تو رسولِ اکرمؐ کی حدیث پاک سے واضح ہوتا ہے کہ "اطلبوا العلم ولو کان بالصین" علم حاصل کرو ہر چند کہ وہ چین میں ہی کیوں نہ ہو۔"

یعنی علم کے حصول میں کتنی بھی مشکلات کیوں نہ ہوں ان کی پرواہ نہ کرو اور دوسرے یہ کہ اس بات کا خیال نہ کرو کہ علم کہاں سے آ رہا ہے۔ یہی علم جب انسانی شخصیت کا جزو بنتا ہے اور اس کے اعمال کا رہبر، تو انسان منزلِ حکمت تک پہنچتا ہے اور قرآنِ مجید کے الفاظ میں رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشن کا مقصد ہی انسانوں کو اس منزل پر پہنچانا تھا۔

علم و معرفت

جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانیت کو جو انقلابی پیغام پہنچایا اس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے انہوں نے اپنے گرد و پیش میں کچھ شخصیات کا ایک عظیم گروہ جمع فرمایا اور انہیں اپنی تربیت سے نوازا تاکہ وہ ان کے پیغام کو انسانیت تک پہنچائیں۔ حضور اکرمؐ کی تربیت تدریس تک محدود نہ تھی بلکہ انہوں نے اپنی شخصیت کے نفوذ کے سہارے اپنے ساتھیوں میں اسلام کی تعلیمات کو مجسّم صورت دینے کا کام سر انجام دیا۔ ان کی زندگی میں جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کفارِ قریش کے لیڈروں کی طرف سے یہ دعوت دی گئی تھی کہ وہ مکہ کے بادشاہ بن جائیں۔ اگر ان کے بجائے کوئی دنیا دی سیاست دان قسم کی شخصیت ہوتی تو وہ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر مکّے کی بادشاہت قبول کر لیتے اور پھر شاہی فرامین کے ذریعے سے اسلام کو نافذ فرماتے۔ لیکن حضور اکرمؐ کی فراست نے اسے غلط طریقۂ کار سمجھا کیونکہ انہیں اس حقیقت کا علم تھا کہ جب امراء و ملوک کی شخصیت کے زیر اثر دین قبول کرتے ہیں تو پھر اس شخصیت کے اُٹھ جانے کے بعد دوسری شخصیت کے زیر اثر دین کو ترک بھی کر دیتے ہیں۔ لیکن حضورؐ تو ایک ایسا دین لے کر آئے تھے جسے قیامت تک کے لیے پوری انسانیت کو فیضیاب کرنا تھا۔ اس لیے انہوں نے قرآنی ہدایات کے مطابق اپنے پیروکاروں کو تلاوتِ آیات اور تزکیہ نفس کی منزل سے گذارنا بہتر سمجھا۔

جن شخصیات نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فیضان تربیت حاصل کیا ان میں خوش نصیب ترین امیر علیہ السلام تھے کہ بچپن ہی سے تربیت محمدیؐ کی شعاعیں ان کے جسم و جان کو منوّر کرتی رہیں۔ سنتِ رسولؐ کی تقلید میں جناب امیر علیہ السلام نے بھی وہی طریقۂ کار اختیار کیا جو ان کے آقا و مولا نے استعمال کیا تھا۔ یعنی پہلے تزکیہ نفوس اور اس کے بعد تعلیم کتاب و حکمت ۔

اسی بناء پر جناب امیرؑ نے نہج البلاغہ کے پہلے خطبے کی ابتداء ہی یوں کی ہے کہ اول دین معرفت

جس کا مطلب یہ ہے کہ دین کی پہلی سیڑھی معرفتِ خدا ہے۔ دوسرے الفاظ میں جناب امیرؑ ہمیں یہ تلقین فرما رہے ہیں کہ جب تک ہم دین کی اساس کو صحیح معنوں میں سمجھ نہ پائیں اسوقت تک ہم اس دین کو درست طریقہ پر اختیار نہیں کر سکتے۔ اب اسلام ایک ایسا دین ہے جس کی اساس توحید پر ہے اور اسی تصوّرِ توحید کی بنیاد پر اسلام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسی بنا پر شرک اسلامی تعلیمات میں سب سے بڑا گناہ ہے جس کی سزا معاف نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا دینِ اسلام کی اساس کو سمجھے بغیر جب دین اختیار کیا جائیگا تو اس کی مثال اس درخت کی سی ہوگی جسے کسی جگہ سے اکھاڑ کر کسی اور جگہ پر لگا دیا جائے اور اس کی جڑیں زمین میں اپنا گھر نہ بنا سکیں۔ اب توحید ایک تصوّر ہے اس تصوّر کا ادراک کرنے کے لیے ہم انسانوں کو سمعی، بصری معاونات کے ذریعے سے مدد نہیں دے سکتے۔ دوسرے تصوّرات کی مانند اس تصوّر کا ادراک کرنے کے لیے بھی اس امر کی ضرورت ہے کہ انسان کا ذہن اس طرح صیقل ہو جائے کہ اس میں اس کی جھلک نظر آسکے۔ اور انسانی ذہن کو صیقل کرنے کے لیے تعلیم و تعلّم ہی ایک ذریعہ ہے۔ انسان علم حاصل کرتا ہے لیکن اگر وہ علم صرف حصول کی منزل تک رہ جائے تو وہ انسان کے کام نہیں آتا جب تک ہم اپنے حاصل کردہ علم کو اپنی شخصیت کا جزو نہ بنالیں اس وقت تک وہ علم اوپری حیثیت رکھتا ہے اور کسی وقت بھی ہم سے جدا ہو سکتا ہے لیکن جب یہ علم شخصیت کا جزو بن جائے تو پھر ہماری ساری کارکردگی اس علم کے زیرِ اثر ہوتی ہے اور اسی منزل کو معرفت کی منزل کہتے ہیں۔ جناب امیر علیہ السّلام نے اپنے اس قول میں ہمیں اس طرف متوجہ کیا ہے۔ کہ محض زبان سے یہ کہہ دینا کہ خدا ایک ہے یا اللہ کے سوا کوئی بھی نہیں کافی نہیں بلکہ وہ جناب امیر المومنین ہی کے قول کے مطابق علم مسموع ہے جس کے جدا ہونے کا خدشہ ہمیشہ لاحق رہتا ہے۔ ایک خدا پر یقین رکھنا یا توحید پر ایمان لانا دوسرے ادیان کا دعویٰ بھی ہے۔ ہندو مت والے بھی یہی بات کہتے ہیں اور عیسائیت اور یہودیت میں بھی خدا کی وحدت کا اقرار کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود خدا کے تصوّر کے غلط ادراک کی بنا پر شرک اور بت پرستی کو ظاہر کر رہی ہے۔ تصوّرِ الٰہ کی معرفت حاصل نہ کرنے کی بنا پر انسانوں نے ذاتِ ایزدی کو اپنے روپ میں ڈھالنے کی کوششیں کی ہیں اور خدا کی صفات کو مختلف

تجسیمی مظاہر کی شکل میں اپنے سامنے رکھ کر اس کی پوجا شروع کر دی۔ لیکن اگر تصوّرِ خالق کا درست ادراک ہو تو پھر انسان ان حرکتوں پر آمادہ ہی نہیں ہو سکتا۔ دوسرے لفظوں میں اگر معرفت خدا کی منزل حاصل ہو جائے تو پھر غیر اللہ کا تصوّر انسان کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔

جناب امیرالمومنین نے اس قول میں معرفتِ خدا کی اہمیت پر زور دیا ہے تاکہ ہم عدم معرفت کی بنا پر غلط قدم نہ اٹھا سکیں۔ جناب امیر نے یہ بیان فرمانے کے بعد کہ دین کی ابتداء معرفتِ خدا ہے ارشاد فرمایا ہے کہ جب یہ معرفت اپنے کمال کو پہنچتی ہے تو پھر انسان تصدیق کی منزل پر پہنچتا ہے اور جب تصدیق کی منزل طے کر لیتا ہے تو پھر توحید کی منزل آتی ہے۔ جب ہم منزلِ توحید پر اس رستے سے ہو کر پہنچتے ہیں تو پھر غلط قدم نہیں اٹھا سکتے جب مسلمان منزلِ توحید پر پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کی پوری زندگی خدا ہی کے لیے ہو جاتی ہے اور غیر خدا کے سامنے اس کا سر جھک ہی نہیں سکتا۔

حصولِ علم

دین اسلام بہت سی باتوں میں دیگر ادیانِ عالم سے ممیز ہو جاتا ہے ان میں سے بنیادی بات یہ ہے کہ اسلام لوگوں کو دنیاوی زندگی سے بیزار کر کے انھیں ترکِ دنیا پر آمادہ نہیں کرتا۔ بلکہ اسے دنیاوی زندگی کو ثمر آور بنانے کی راہ دکھاتا ہے۔ اس زندگی کو درست طریقے پر بسر کرنے کیلئے جو طریقہ سکھایا ہے اس میں حصولِ علم پر بے حد زور دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں احادیث نبوی میں اقوال آئمہ و بزرگانِ دین میں علم و اہلِ علم کی فضیلت کا بار بار تذکرہ ہے اور اس کے ذریعے سے مسلمانوں کو شوق دلایا گیا ہے کہ وہ علم کے حصول میں کوشاں رہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ: اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَی اللَّحْدِ یعنی گہوارے سے قبر تک علم حاصل کیجئے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے۔ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ کَانَ بِالصِّیْنِ۔ علم حاصل کرو چاہے وہ چین ہی میں کیوں نہ ہو۔ پھر جہاں بعض دیگر مذاہب و ادیان نے حصولِ علم کو ایک خاص طبقے تک محدود رکھا وہاں اسلام نے سب انسانوں پر اسے عام کیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے فرض کیا کہ وہ علم حاصل کریں۔ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے علم کو وہ فضیلت دی کہ وہ اپنے آپ کو مدینۃ العلم کہا۔ آج ہم اسی شہر علم کے دروازے حضور مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے شاگرد رشید حضرت علی علیہ السلام کا ایک قول علم ہی کے بارے میں پیش کر رہے ہیں۔

جناب امیر علیہ السلام فرماتے ہیں: اَوْضَعُ الْعِلْمِ مَا وَقَفَ عَلَی اللِّسَانِ وَ اَرْفَعُهٗ مَا ظَهَرَ فِی الْجَوَارِحِ وَالْاَرْکَانِ۔ اس قول کا ترجمہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ سب سے گھٹیا علم وہ ہے جو زبان تک رہے۔ اور بہترین علم وہ ہے جو اعضاء و جوارح سے ظاہر ہو۔

اس قول سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ جناب امیر علیہ السلام علم کی دو قسمیں بتاتے ہیں۔ ایک علم وہ جو صرف زبان تک محدود رہتا ہے یعنی سطحی ہوتا ہے اور علم کی دوسری قسم وہ

ہے جس میں علم شخصیت کا جزو بن جاتا ہے اور اس کے اثرات انسان کے اعمال سے ظاہر ہوتے ہیں اس سطحی علم کو جو صرف زبانی جمع خرچ تک محدود ہوتا ہے نظری علم کہا جاتا ہے جو انسان کے پاس ہوتا تو ہے لیکن وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ اس کی مثال کنجوس کے مال کی ہے جو ہوتا تو ہے لیکن اس کے باوجود کنجوس اس سے استفادہ نہیں کر پاتا اور اس کے ہوتے ہوئے بھی غربت و افلاس کا شکار رہتا ہے۔ ایسا علم بے کار کی مشقت ہے اسے حاصل کرنا وقت کا ضائع کرنا ہے۔

اسلام کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ انسان جو کام کرے وہ اللہ کی خوشنودی کے لیے ہو اور خداوند عالم کی خوشنودی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب اس کے احکام کے مطابق انسان دوسرے انسانوں کی خدمت کرے۔ اسلام کی تمام عبادات میں اس اجتماعی فلسفے کی جھلک ملتی ہے کیونکہ اسلام ایک ایسا دین ہے جو زندگی کو آگے بڑھاتا ہے۔ اور انسانی معاشرے کو صحتمند اصولوں کے مطابق منظم کرتا ہے۔ اب انسانی معاشرے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ جب انسان ایکدوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور اپنی صلاحیتوں کو خدا کے بندوں کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کریں لہٰذا لازم آتا ہے کہ جو انسان علم حاصل کرے وہ اپنی علمی قابلیت کو ارشادات الٰہی اور سنت نبوی کے مطابق استعمال کرے تاکہ وہ اپنے معاشرے کی تعمیر میں مدد دے سکے۔ لیکن وہ شخص جو علم حاصل تو کرتا ہے لیکن علم سے فائدہ حاصل نہیں کرتا اور اس علم کا اس کی شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا وہ دراصل اپنے آپ کو نقصان پہنچانے کے علاوہ اپنے معاشرے کو نقصان پہنچاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے ساتھی انسانوں کو اس فائدے سے محروم کر دیتا ہے جو اس کا علم انہیں پہنچا سکتا ہے اس لیے اسلام میں علم و عمل دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ محض علم حاصل کرنا کھوٹے سکے جمع کرنے کے مترادف ہے۔ اسی بنا پر حضرت علی علیہ السلام نے اس علم کو گھٹیا قسم قرار دیا ہے جو صرف زبان تک رہے اور اس علم کو ارفع و اعلیٰ کہا ہے جو اس علم کے حاصل کرنے والے کے اعمال سے ظاہر ہو۔ اس بات کو جناب امیرالمومنینؑ نے اور مقام پر یوں ادا کیا ہے کہ علم عمل کو آواز دیتا ہے۔ اگر اسے جواب مل جائے تو وہ صاحب علم کے پاس رہتا ہے اور جواب نہ ملے یعنی عمل کا اظہار نہ ہو تو وہ اس عالم کا ساتھ چھوڑ دیتا

ہے۔ اور کسی اور کے پاس چلا جاتا ہے۔ ہمارا اپنا تجربہ بھی اس بات کو ثابت کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرکے ڈگری حاصل کرلے لیکن پریکٹس نہ کرے تو کچھ مدت کے بعد وہ اپنی تمام معلومات بھول جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تمام محنت، وہ تمام وقت اور وہ تمام پیسہ جو اس قسم کے علم حاصل کرنے میں خرچ ہوا اکارت گیا اور یوں نہ صرف علم حاصل کرنے والے کو نقصان ہوا بلکہ بالواسطہ طور پر اس معاشرے کو ضرر پہنچا جس میں اس قسم کا صاحب علم رہ رہا ہو۔

یہی سبب ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اس علم کو بہترین قرار دیا جو اپنے آپ کو عمل کے سانچے میں ڈھال دے ان کے نزدیک علم و عمل کا یکجا ہونا دین کا کمال ہے۔ فرماتے ہیں۔ اِنَّ كَمَالُ الدِّيْنِ طَلَبُ الْعِلْمِ وَالْعَمَلُ بِهِ ۔ یعنی دین کی مکمل ترین شکل علم کا حاصل کرنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔

علم اور معاشرہ

دنیا کے دوسرے ادیان و مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی جو خصوصیات اسے درجۂ امتیاز پر فائز کرتی ہیں ان میں ایک بات علم کے بارے میں اسلام کا رویہ ہے۔ ادیان عالم کی تاریخ کا ایک سرسری مطالعہ اس بات کو دریافت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اسلام کے سوا دوسرے تمام ادیان و مذاہب نے نہ صرف یہ کہ اپنے ماننے والوں کو حصولِ علم پر اکسایا نہیں بلکہ اکثر اوقات انہیں حصولِ علم و معرفت سے روکا ہے اور یہ فریضہ صرف ایک مخصوص طبقے کو سونپ دیا ہے اس کے برعکس اسلام نے ہر مسلمان مرد اور عورت پر علم حاصل کرنا فرض قرار دیا اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر اور عقل کو کام میں لا کر مخلوقات کے بارے میں غور کریں۔ اور یوں اپنے خالق کو پہچانیں۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَ بِالصِّيْن یعنی علم اگر چین میں بھی ہو تو اسے حاصل کرو۔ اسی بنا پر مسلمانوں کی تاریخ کے اوراق اور باتوں کے علاوہ علمی فتوحات کے ذکر سے بھی روشن ہیں۔

جناب امیر المومنین علیہ السلام، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت کے ایک درخشندہ نمونہ تھے اور خود حدیث شریف میں ان کو باب مدینۃ العلم کہا گیا ہے۔ اسی لیے حضرت علیؑ کی زندگی علم و معرفت کی ترویج کی ایک عظیم داستان ہے۔ ان کے خطبات اور مکاتیب میں جابجا علم کی فضیلت اور عالم کی عظمت پر زور دیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے ایک خطبے کی ابتدا ہی اس جملے سے کی ہے کہ اول الدین معرفتہ۔ یعنی دین کی ابتدا ہی معرفت خدا سے ہوتی ہے۔ آج کی صحبت میں ان کا ایک قول علم ہی کے بارے میں پیش کیا جاتا ہے جس میں انسانی معاشروں کے عروج و زوال کا ایک بنیادی اصول واضح کیا گیا ہے۔

جناب امیر علیہ السلام کا قول یہ ہے کہ اِذَا اَرْذَلَ اللّٰہُ عَبْدًا حَظَرَ عَلَیْهِ الْعِلْمَ۔ یعنی جب خداوند عالم کسی بندے کو رذیل بنا دیتا ہے تو علم کے دروازے اس پر بند کر دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس بندے کو علم سے محروم کر دیتا ہے اس

قول کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ جناب امیر علیہ السّلام کے نزدیک کسی شخص کی رذالت کی نشانی یہ ہے کہ وہ علم سے بے بہرہ ہو۔ جس دَور میں جناب امیرؑ نے یہ قول ارشاد فرمایا، اس میں عربوں کے ہاں وجاہت اور حیثیت کا معیار مال و دولت تھا اور جن کے پاس دولت نہیں ہوتی تھی انسے وہ حقیر گردانتے تھے۔ یہ معیار ہر دَور میں رہا ہے اور آج بھی ہے۔ لیکن جناب امیر علیہ السلام نے انسانی قدر و منزلت کے اسلامی معیار کو دنیا کے سامنے پیش کیا کہ کسی شخص کا فقیر و رذیل ہونا اس کے بے زر ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ اس کے بے علم ہونے کے سبب سے ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۴۷ ویں میں مذکور ہے کہ یہودیوں کو ان کے نبی نے اطلاع دی کہ خداوندعالم نے طالوت کو ان کا امیر بنایا ہے تو اس پر حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ وہ ان کا امیر کیونکر ہو سکتا ہے کیونکہ اس کے پاس تو دولت نہیں اس پر ان کے نبی نے انھیں بتایا کہ۔ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۔ یعنی خدا نے طالوت کو تم پر فضیلت دی ہے اور علم و جسم کی کشادگی عطا فرمائی ہے ۔ اس آیۂ مبارکہ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ خداوند کائنات کے نزدیک بھی معیار فضیلت مال و دولت نہیں بلکہ علم و جسم کی طاقات ہیں۔

اس بات سے قطع نظر جناب امیر علیہ السّلام کے اس قول میں انسانی معاشروں کی حرکیات کا ایک اصول بھی واضح کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسانی معاشرے، مال و دولت، اسی قسم کی کسی اور چیز کی بنا پر فوقیت حاصل نہیں کرتے بلکہ ان کی ترقی کا اصل راز ان کی علمی فتوحات میں مضمر ہوتا ہے۔ تاریخ اسلام میں ممالک اسلامیہ پر منگولوں کا حملہ اپنی وحشت ناکی کے لیے مشہور ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ منگولوں نے اسلامی ممالک پر قبضہ تو کر لیا لیکن مسلمانوں کی علمی ترقی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور بالآخر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں اسی جانب اشارہ کیا ہے:

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

وہ معاشرے جو علمی ترقیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں، وہ زیادہ دیر پنپ نہیں سکتے

اور بالآخر زوال کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

جناب امیر علیہ السلام نے اپنے کلام میں علم اور علم کے ساتھ عمل کی اہمیّت پر جو بار بار زور دیا ہے اس کے پیشِ نظر ان کا یہ قول زیادہ واضح ہو جاتا ہے کیونکہ وہ علم کو رذالت کا الٹ قرار دیتے ہیں اس لیے وہ انسان کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ علم حاصل کرے اور اسے استعمال کرے کیونکہ انھیں کے ایک قول کے مطابق جب علم کو عمل میں نہ ڈھالا جائے تو کچھ دیر کے بعد وہ صاحب علم کا ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ ان کے ہاں علم کی اہمیّت اس قدر زیادہ ہے کہ وہ انسان کو عالم یا متعلم کے علاوہ کسی اور شکل میں دیکھنا پسند نہیں کرتے۔

دین کی اوّلین منزل

نہج البلاغہ میں موجود پہلے خطبہ میں حضرت علی علیہ السلام نے اصولِ اسلام کے بارے میں ارشاد و ہدایت کی راہیں روشن فرمائی ہیں۔ اس سلسلہ میں دین کی اساس کے متعلق ان کا ایک قول آج کی گفتگو کا موضوع ہے اور وہ قول یہ ہے کہ : اَوَّلُ الدِّیْنِ مَعْرِفَتُہٗ یعنی دین کی ابتدائی منزل خدا کی معرفت ہے۔ دوسرے لفظوں میں دین پر چلنے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ مسلمان اپنے خالق اور پالنے والے کی معرفت حاصل کرے کہ اس کے حصول کے بغیر دین کا سفر ممکن نہیں۔ اس قول کو پڑھ کر پہلی بات جو ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ جناب امیرؑ بغیر معرفت خدا دین کو ممکن نہیں گردانتے کیونکہ جب دین کی پہلی منزل ہی طے نہ ہو تو باقی منزلوں تک پہنچنا کیونکر ممکن ہوگا۔ ان کا یہ قول ارشاداتِ ربّانی اور تعلیمات نبوی کا آئینہ دار ہے اور یہی بات اسلام کو دوسرے ادیان و مذاہب سے ممتاز کر دیتی ہے اسلام اپنے ماننے والوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر اور علم و معرفت کی راہ پر لگا کر انہیں دیندار بناتا ہے۔ یہ بات دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی۔ قرآن مجید پر نظر ڈالیں تو بار بار ایسی آیات ملتی ہیں جس میں انسانوں کو سوچنے سمجھنے، غور و فکر کرنے اور عقل سے کام لینے کی تلقین کی گئی ہے۔ بار بار اس بات کا تقاضا کیا گیا ہے کہ کائنات پر غور کرو۔ اور پھر اس کے خالق کو پہچانو۔ ایک مقام پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائض کا ذکر کرتے ہوئے ارشادِ الٰہی ہوتا ہے کہ :

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔

یعنی اس آیت کے مطابق ہادیٔ دو عالم رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جن مقاصد کے حصول کے لیے مبعوث فرمایا گیا وہ چار ہیں۔ تلاوتِ آیاتِ الٰہی، تزکیہ نفوس، تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت۔ گویا چار میں سے تین مقاصد ایسے ہیں جن کا تعلق براہِ راست علم و معرفت سے ہے۔ قرآن مجید کے علاوہ احادیث شریفہ میں بار بار حصول علم پر زور دیا گیا ہے۔ کبھی ارشاد

ہوتا ہے اطلبوا العلم من المھد الی اللحد ۔ یعنی گھوارے سے لے کر قبر تک علم حاصل کرو۔ کبھی ارشاد نبوی طلب علم کو ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے فریضہ قرار دیتا ہے غرضیکہ طلب علم وحصول حکمت پر جناب سرور کائنات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بار بار زور دیا ہے اور حدیث کی تمام مستند کتابوں میں فضیلتِ علم کے بارے میں احادیث کے مستقل ابواب موجود ہیں، مختصراً یوں کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں دین کی عمارت کی بنیاد علم پر رکھی گئی ہے اور اسی علم کی بنیاد پر قرآن مجید میں فرشتوں کے مقابلے میں حضرت آدم علیہ السّلام کی افضلیت کا اثبات ملتا ہے۔

دوسری بات جو اس قول کو پڑھ کر ذہن میں ابھرتی ہے وہ یہ ہے کہ جناب امیر علیہ السّلام نے دین کی ابتدائی منزل علم خدا کو قرار نہیں دیا بلکہ معرفت خدا کو۔ علم اور معرفت میں بڑا فرق ہے۔ علم جاننے کے معنوں میں یعنی کسی شے کے ہونے کے اقرار کے مفہوم میں آتا ہے اور معرفت کا اطلاق کسی شے کے ہونے کے اقرار کے مفہوم میں آتا ہے اور معرفت کا اطلاق کسی شے کا علم حاصل کرنے کے بعد اسے پہچاننے پر ہوتا ہے ۔ یہ ضروری نہیں کہ کسی شے کا علم حاصل کرکے ہم اسے پہچاننے لگیں یہ منزل بعد میں آتی ہے لیکن پہچاننے کے لیے یہ لازم ہے کہ پہلے اس شے کا علم حاصل کیا جائے۔ علم بغیر معرفت ممکن ہے لیکن معرفت بغیر علم ممکن نہیں، دوسرے لفظوں میں حضرت علیؑ ہمیں یہ بتا رہے ہیں کہ محض خدا کو جان لینا کافی نہیں بلکہ اسے جاننے کے بعد پہچاننا بھی ضروری ہے اور یہی پہچان دین کی پہلی منزل ہے۔ معرفتِ خدا کے حصول کے لیے علم ذاتِ الہٰی ضروری ہے۔ اسی لیے اسلام میں حصول علم پر زور دیا گیا ہے اور حصول علم میں کسی خاص علم کی قید نہیں بلکہ ہر علم قابل حصول ہے کیونکہ ہر علم حسن نیت اور عمل خیر کے ساتھ مل کر معرفتِ خدا کی منزل تک لے جاتا ہے۔ بے علم سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ جہالت میں رہ کر معرفتِ خدا کو حاصل کرے۔

حضرت علی علیہ السلام کا یہ قول قرآن وحدیث کی روشنی میں پڑھیں تو ہم پر یہ بات واضح ہوجاتی ہے۔ اسلام اوہام و اساطیر کے گورکھ دھندے میں نہیں پھنساتا بلکہ یہ اپنے ماننے والوں کو عقل و خرد اور علم و معرفت کی روشنی میں اطاعت خالق کی راہ دکھاتا ہے۔ اسلام روشن دماغی اور روشن ضمیری کا رستہ ہے اور یہ زندگی کو جہالت کی تاریکیوں میں بسر کرنے کے بجائے علم و معرفت کی روشنی میں گذارنے کا طریقہ ہے۔

اسلامی عبادات

وہ باتیں جو اسلام کو دوسرے ادیان و مذاہب سے ممتاز کرتی ہیں ان میں عبادت کا تصوّر بھی ہے دوسرے مذاہب میں عبادت کا تصوّر میکانکی ہے جن میں چند مخصوص افعال یوں ادا کیئے جاتے ہیں کہ انسانی شعور ان کے نزدیک بھی نہیں بھٹکتا۔ یہ افعال بالکل مشین کی طرح ادا کیئے جاتے ہیں۔ لیکن اسلام کا تصوّرِ عبادت میکانکی نہیں انسانی ہے۔ اس میں نیّت، ارادہ اور شعور برابر کارفرما نظر آتے ہیں اگر اعمال سرانجام دیئے جائیں اور ان کی بجا آوری کے دوران میں انسانی نیّت، انسانی ارادہ اور انسانی شعور کارفرما نہ ہوں تو وہ اعمال بے قیمت اور بے وقعت ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں جناب امیرالمومنینؑ کا یہ قول ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں۔

كَمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ صِيَامِهِ إِلَّا الْجُوْعُ وَالظَّمَأُ
كَمْ مِنْ قَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ قِيَامِهِ إِلَّا السَّهَرُ وَالْعَنَاءُ حَبَّذَا
نَوْمُ الْأَكْيَاسِ وَأَفْطَارُهُم۔

اس قول کا ترجمہ یوں ہو سکتا ہے کہ کتنے روزہ رکھنے والے ہیں جن کو ان کے روزے سے بھوک اور پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور کتنے ہی ایسے نمازی ہیں جنہیں ان کی نماز سے سوائے جاگنے اور تھکنے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ کیا کہنے ہیں اہلِ عقل و معرفت کی نیند کے اور ان کے افطار کے !!

جناب امیرالمومنینؑ نے اپنے اس قول میں اسلام کے اس حرکی تصوّر کا سراغ دیا، جو عبادات سے تعلق رکھتا ہے۔ دین کے بارے میں جن کو درست تصور حاصل نہیں ہوتا وہ یہ خیال کر بیٹھتے ہیں۔ کہ دیندار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان دنیا سے الگ تھلگ ہو کر صرف پوجا پاٹھ میں لگا رہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ لوگ دین کو چند ظاہری اعمال تک محدود کر دیتے ہیں اور یہ تصوّر کر بیٹھتے ہیں کہ اگر یہ اعمال سرانجام دے دیئے جائیں تو دین کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔ مگر جناب امیر علیہ السلام کے اس قول پر غور فرمایئے تو

معلوم ہوگا کہ جناب علی مرتضیٰ علیہ السلام اہلِ معرفت کی نیند کو دوسرے لوگوں کی عبادت شب پر ترجیح دیتے ہیں اور ان حضرات کے روزہ نہ رکھنے کو دوسرے لوگوں کے روزوں پر فضیلت دیتے ہیں۔ اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ باب مدینۃ العلم کے نزدیک یہ عبادات مقصود بالذّات نہیں کسی اور اعلیٰ مقصد کے حصُول کا ذریعہ ہیں۔ اگر ان عبادات سے وہ مقصد حاصل نہ ہو تو پھر یہ عبادات بے رُوح جسم کی مثال ہیں۔

اصل میں اسلام میں عبادت کا مفہوم دوسرے ادیان کے مفہوم سے بالکل مختلف ہے یہاں عبادت سے مُراد اطاعتِ خُدا ہے لیکن اگر عبادت (عام مفہوم میں) اطاعتِ خدا سے الگ کر دے تو وہ عبادت نہیں بلکہ احکام ایزدی کی خلاف ورزی ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر حکمِ خدا یہ ہے کہ ہم حالتِ سفر میں نماز قصر ادا کریں لیکن اگر کوئی شخص یہ تصوّر کر کے نماز پوری پڑھے تو بظاہر تو یہ نماز ہوگی لیکن در اصل حکمِ خدا کی خلاف ورزی ہوگی۔ یوں یہ نماز ثواب کی بجائے غضبِ الٰہی کی موجب ہوگی۔

اسلامی عبادات کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں انسان کی نیت اور شعور کو بڑی اہمیّت حاصل ہوتی ہے۔ اگر انسان نماز پڑھے یعنی قیام، قعود، رکوع اور سجود بجالائے لیکن وہ نیت نہ کرے یا دورانِ نماز میں اس کی نیت برقرار نہ رہے تو نماز باطل ہو جاتی ہے۔ یہی صورت روزے، زکوٰۃ، حج اور خمس وغیرہ کی کہ ان سب میں انسان کا بالغ و عاقل ہونا اور ان کے ادا کرنے کی نیّت کرنا لازم ہے ورنہ یہ اعمال ظاہری اعتبار سے تو شاید عبادات کے زمرے میں شمار ہوں لیکن خداوندِ عالم کی نگاہ میں کوئی وقعت نہ رکھیں گے۔

ایک مشہور واقعہ ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام حج کے موقع پر حرم کعبہ میں تشریف فرما تھے کہ ان کے اصحاب میں سے ایک نے ان سے کہا مَا أَكْثَرَ الْحَجِيجَ! یعنی حاجی کس کثرت سے ہیں تو امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ: مَا أَكْثَرَ الضَّجِيجَ وَمَا أَقَلَّ الْحَجِيجَ یعنی شور اور ازدحام کس قدر ہے اور حاجی کتنے کم ہیں۔ اس میں جناب امیر علیہ السلام کے مذکورہ بالا قول کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس سے ہمیں اس بات کا سراغ ملتا ہے کہ صرف ظاہری اعمال کو دیکھ کر دھوکے میں نہ آجائیں بلکہ یہ دیکھیں کہ ان

اعمال سے اصل مقصد حاصل ہو جاتا ہے نہیں اگر عبادات میں احکام الٰہیہ کی بجاآوری کا جذبہ موجود نہ ہو تو وہ عبادات نہیں بلکہ صرف جسمانی حرکات ہیں۔

مزید یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ہمارا اصل فریضہ حکم خدا کی بجاآوری ہے اگر کسی وقت حکم الٰہی یہ ہو کہ ہم روزہ نہ رکھیں تو روزہ نہ رکھنا عبادت بن جاتا ہے اور اس حالت میں روزہ رکھنا معصیت کا حکم رکھتا ہے۔ یہ عبادات صرف خدا کے لیے ہیں اگر ان کے ادا کرنے میں کسی بندے کو خوش کرنے کا مقصد شامل ہو جائے تو پھر یہ اپنی اصلی غرض و غایت کھو بیٹھتی ہیں۔

مذکورہ بالا قول کے آخری حصے میں جناب امیر علیہ السلام نے "اَلْأَکیاس" کی لفظ استعمال کی ہے جو کَیِّس کی جمع ہے جس کے معنی اہلِ عقل و معرفت کے ہیں۔ اس ٹکڑے میں مولائے مومنان ؑ نے ہماری توجہ حصولِ معرفت کی جانب بھی مبذول کرائی ہے اور ہمیں اس امر کا احساس دلایا ہے کہ معرفت کی موجودگی میں نیند بھی عبادت بن جاتی ہے اور وہ نیند ان لوگوں کی عبادت شب سے بہتر ہے جو معرفت نہیں رکھتے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مسلمان کی پوری زندگی اور اس کے تمام اعمال عبادت کے زمرے میں شامل ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ اعمال خوشنودیٔ خالق کے لیے اور احکام الٰہیہ کے مطابق ادا ہوں نماز ان تمام عبادات سے افضل ہے لیکن اگر نماز ادا کرنے میں حکمِ خدا کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو وہ نماز نماز نہیں بلکہ جناب امیر علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق تھکن کا باعث بن جاتی ہے۔

حقوق العباد

اسلام میں بہت سے خصائص ایسے ہیں جو اسے دوسرے ادیان و مذاہب سے ممتاز کردیتے ہیں۔ ان میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ جہاں اور مذاہب فرد کو صرف نجات اُخروی کے لیے تیار کرتے ہیں اور اس کا رابطہ اپنے خالق سے استوار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہاں اس کے برعکس اسلام انسانوں کی فلاح دنیوی اور نجاتِ اُخروی دونوں کے لیے تیار کرتا ہے۔ اور فرد کا رابطہ بیک وقت اپنے خالق سے بھی استوار کرتا ہے اور اپنے جیسے دوسرے افراد سے بھی۔ اسی لیے اسلامی حدود و تعزیرات میں جہاں حقوق اللہ کی خلاف ورزی کی سزا معین ہے وہاں حقوق العباد کی خلاف ورزی کی سزا بھی مقرر ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق حقوق عباد کی بیحد اہمیت ہے۔ اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہٖ وسلّم ہمارے سامنے ہے۔ غلاموں کے بارے میں، مسکینوں کے بارے میں، ناداروں کے بارے میں، یتیموں کے بارے میں، جو ہدایات موجود ہیں۔ اُن سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام ان اجتماعی مسائل کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اسی سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام کا ایک مختصر سا قول آج ہمارے پیش نظر ہے اور وہ یہ ہے۔

بِئْسَ الزَّادِ اِلَى الْمَعَادِ اَلْعُدْوَانُ عَلَى الْعِبَادِ

یعنی روز قیامت کیلئے بدترین پونجی بندگان خدا کے خلاف عدوان ہے۔

عدوان کے لفظ میں جو مفاہیم پوشیدہ ہیں۔ ان میں دشمنی، عناد، ظلم وستم، جور و تعدی سختی اور جارحیت سب کچھ شامل ہے۔ گویا جہاں امیرؑ یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ اگر تم خدا کے بندوں پر سختی کروگے، ان پر ظلم و ستم روا رکھوگے۔ ان پر مظالم ڈھاؤگے اُن سے دشمنی اور معاندانہ سلوک کروگے تو روزِ قیامت کے لیے بدترین پونجی جمع کروگے۔ اس قول کو ذہن میں رکھئے اور پھر اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ ــــ یعنی دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ اس بات کو بھی دھیان میں لائیے اور اس قرآنی اصول پر بھی غور فرمالیجئے۔

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَہٗ ط وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَہٗ۔

یعنی جس شخص نے ذرّہ برابر نیکی کی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی تو اسے دیکھ لے گا۔

اس آیت کریمہ کے مطابق دنیا میں کئے گئے اعمال نیک یا اعمالِ بد ہمیں دیکھنا پڑیں گے اس کا مطلب واضح طور پر یہ ہے کہ ہم اپنے بُرے اعمال سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اور کوئی شخص ہماری مدد نہ کرے گا۔ اب حضرت علی علیہ السلام کے قول کے مطابق سب سے بڑی پونجی یعنی سب سے بُرے اعمال وہ ہیں جن میں بندگانِ خدا پر ظلم وستم روا رکھا جائے۔ دوسرے لفظوں میں جناب امیرؑ ہمیں یہ ہدایت فرما رہے ہیں کہ دیکھو حقوق خداوندی کے ساتھ ساتھ حقوق بندگانِ خدا کو نہ بھولنا کیونکہ اگر تم نے بندگانِ خدا کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا تو خدا تمہیں بخشنے کا نہیں اور روز قیامت تمہیں ان اعمالِ بد کا سامنا کرنا پڑے گا جو تم نے بندگانِ خدا پر روا رکھے اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم حقوقِ خدا کو بھلا بیٹھیں بلکہ یہ ہے کہ جس طرح حقوقِ خدا کی بجاآوری ضروری ہے اسی طرح حقوق عباد کی بھی۔ کہ یہ دونوں حقوق ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور کسی ایک میں کوتاہی قابلِ مواخذہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن مجید کی آیات خصوصاً سورہَ ماعُون سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ خداوندِ عالم ان نمازیوں پر ناراض ہوتا ہے جو حقوق بندگانِ خدا ادا نہیں کرتے۔

وَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاۗءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۔

ہلاکت ہے" ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے غافل رہتے ہیں جو دکھاوے کا کام کرتے ہیں اور جو روزمرّہ کے استعمال کی چیزیں دینے سے گریز کرتے ہیں۔

حقوق اللہ اور حقوق عباد دونوں کا بیک وقت خیال رکھنا اور انہیں ادا کرنا ہی حیات دنیوی اور حیات اُخروی میں فلاح کا باعث ہے۔

حضرت علی علیہ السّلام اور غیر جانبداری

جناب امیر علیہ السّلام کی شخصیت مبارکہ کی عجیب خصوصیت یہ ہے کہ دوستوں اور دشمنوں دونوں نے انہیں اپنے اصلی رتبے سے کہیں کم درجہ دیا ہے۔ دشمنوں کا تو ذکر ہی کیا۔ خود دوستوں نے باب مدینۃ العلم کی ذات کے صرف چند پہلوؤں کے ذکر ہی پر اکتفا کی اور اس طرف بالکل توجّہ نہ دی کہ تربیت رسالت مآبؐ کے اس کامل ترین مردانہ نمونے میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں اور پہلوؤں کے لیئے سامانِ ہدایت موجود ہے۔ آج کی صحبت میں جناب علی مرتضےٰ علیہ السّلام کی شخصیّت کے علمی گوشے سے معمولی سا فیضان حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

دورِ جدید کے اجتماعی رویوں میں جو فیشن چل رہے ہیں ان میں ایک فیشن غیر جانب داری کا اظہار ہے اس کے ماتحت ہمیں دن رات یہ سبق پڑھایا جاتا ہے کہ ہمیں زندگی میں غیر جانب دار رہنے کا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ یہ روّیہ بعض اوقات تو نہایت مناسب اور ضروری ہوتا ہے مثال کے طور پر قاضی یا جج کے لیے فریقین مقدّمہ سے غیر جانبدارانہ سلوک روا رکھنا ہی ضروری ہے لیکن اگر اس روییّے کے اختیار کرنے مبالغہ کیا جائے تو اس کا نتیجہ انسانی اجتماع کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ اگر حق و باطل کے مابین کشمکش کو دیکھ کر ہم اس رویے کو اختیار کرلیں تو اس سے جہاں باطل کی حوصلہ افزائی ہوگی وہاں حق کی حوصلہ شکنی بھی ہونا لازم ہے اسی لیے جناب امیر علیہ السلام نے حضرت مالکؓ بن اشتر کو یہ ہدایت فرمائی کہ اچھّے اور بُرے کے ساتھ یکساں سلوک نہ کریں۔

زندگی جہاں بعض اوقات غیر جانب داری کا تقاضا کرتی ہے وہاں انسانوں سے اس امر کا مُطالبہ بھی کرتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی فریق کا ساتھ دینے کے لیے بھی تیار ہوں، بلبشرطیکہ اس کا موقع ہو کیونکہ اگر ہم دونوں فریقوں کو ایک ہی نگاہ سے دیکھیں تو پھر ظالم اور مظلوم میں فرق کرنا مشکل ہو جائے گا اس سلسلہ میں جہاں امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے:

الراضِی بِفِعلِ قَومٍ کالدّاخِلِ فِیہِ مَعَہُم وَعَلیٰ کُلِّ داخِلٍ فِی باطِلٍ اِثمانِ اِثمُ العَمَلِ بِہٖ وَاِثمُ الرِّضیٰ بِہٖ — یعنی جو شخص کسی گروہ کے فعل

پر راضی ہُوا وہ گویا اس میں ان کا شریک ہے اور ہر شخص جو باطل میں شریک ہو اس پر دو گناہ ہیں ایک باطل پر عمل کا اور دوسرے اس پر رضامندی کے اظہار کا۔ اس قول کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کسی گروہ کو بُرا کام کرتے دیکھ کر خاموش ہو جانا۔ ایک طرح کا اظہار رضامندی ہے۔ گویا وہ خود اس میں شریک ہے۔ دوسرے لفظوں میں بُرائی کو دیکھ کر خاموش رہنے والا بُرائی کا ارتکاب کرنے والے کے مقابلے میں دُگنا گناہگار ہے۔ جناب امیرؑ کا یہ قول امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی زرّین تفسیر ہے اور اصلاح معاشرہ کی بنیاد۔ کیونکہ اگر بُرائی کا ارتکاب ہوتے ہوئے دیکھ کر ہم خاموش رہیں اور کہیں کہ ہمیں کیا!! تو پھر برائی کو جڑ پکڑنے کا موقع مل جاتا ہے اور دوسروں کو اس کے ارتکاب کا حوصلہ ہوتا ہے لیکن اگر افراد معاشرہ اس کی مذمّت کریں تو اس کا ارتکاب کرنے والوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور بُرائی کا سدِّباب ہو جاتا ہے۔ یہ بات عین فطرت کے مطابق اور اجتماعی ضرورت کا تقاضا ہے اسی بنا پر ہر معاشرے میں افراد پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ جرم کا ارتکاب دیکھ کر خاموش نہ رہیں بلکہ فوری طور پر متعلّقہ حکام کو اس کو اطلاع دیں۔ تعزیراتِ پاکستان کے مطابق شہریوں کا فرض ہے کہ ارتکابِ جُرم کی اطلاع پولیس کو دیں ورنہ وہ خود تعزیری کارروائی کے مستوجب ہوں گے۔ اجتماعی نظام جرم وسزا میں جہاں اچھے کو اچھا کہنا ضروری ہے وہاں بُرے کو بُرا کہنا اس کی مذمّت کرنا بھی لازم ہے۔ اسی لیے اسلام نے بار بار حکم دیا ہے کہ بُرائی کو روکو۔ جناب امیر علیہ السلام نے بُرائی کا طریقہ ایک جگہ یوں بیان فرمایا ہے، مَنْ رَأَىٰ عُدْوَانًا يُعْمَلُ بِهِ وَمُنْكَرًا يُدْعَىٰ إِلَيْهِ فَأَنْكَرَهُ بِقَلْبِهِ فَقَدْ سَلِمَ وَبَرِئَ وَمَنْ أَنْكَرَهُ بِلِسَانِهِ فَقَدْ أُجِرَ وَهُوَ أَفْضَلُ مِنْ صَاحِبِهِ وَمَنْ أَنْكَرَهُ بِالسَّيْفِ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا وَكَلِمَةُ الظَّالِمِينَ هِيَ السُّفْلَىٰ فَذٰلِكَ الَّذِي أَصَابَ سَبِيلَ الْهُدَىٰ وَقَامَ عَلَى الطَّرِيقِ وَنَوَّرَ فِي قَلْبِهِ الْيَقِينُ۔

یعنی جو شخص حقوق بندگان خدا پامال ہوتے دیکھے اور حقوق خدا کو غصب ہوتے پائے۔ اور دل سے اس کی مذمّت کرے اسے اس کا اجر ملے گا اور وہ اپنے ساتھی سے بہتر ہے اور جو شخص تلوار سے اس کی مذمّت کرے تاکہ کلمۃ اللہ بلند ہو۔ اور

ظالموں کی بات نیچی ہو تو وہ وہی شخص ہے جس نے ہدایت کا راستہ پالیا اور وہ اس راہ پہ آگیا اور اس کے دل میں نور یقین جلوہ گر ہوا۔

اس قول سے یہ پتہ چلتا ہے کہ برائی کی مذمت اور اس کے خلاف جہاد فرض ہے۔ اور اس سلسلہ میں کم از کم دل سے اس کی مذمت کی جانی چاہیئے۔ ظاہر ہے جب کسی چیز کو دل سے برا جانا جائے تو پھر اس سے رغبت رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ اجتماعی رویّہ کہ برائی کو دیکھ کر ہم یہ کہیں کہ ہمارا کیا بگڑتا ہے کوئی برا کرتا ہے تو اپنے لیے کرتا ہے کم از کم حضرت علیؑ کے نزدیک درست نہیں کیونکہ برائی ایک بار شروع ہو تو پھر اس کے اثرات ارد گرد کے لوگوں پر بھی پڑنا لازم ہیں۔ اور ہم صرف یہ کہہ کر نہیں بچ سکتے کہ ہمیں کیا۔ اور اسی قول سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ برائیاں دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جس میں دوسروں کے حقوق غصب کیے جائیں جن کو حضرت علی علیہ السلام نے عدوان کہا ہے اور دوسری وہ جن میں حقوق اللہ پامال ہوں انہیں حضرت امیرؑ نے منکر کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ دونوں قسم کی برائیوں کے ضمن میں غیر جانب داری کا رویّہ اختیار کرنا معاشرے کو تباہی و بربادی کی طرف لے جاتا ہے۔ اچھے کو اچھا سمجھنا اور کہنا اور برے کو برا سمجھنا اور کہنا، ہمارا اجتماعی فریضہ ہے اگر ہم اس فریضہ سے عہدہ برآنہ ہوں تو ہماری مثال اس شتر مرغ کی ہوگی جو شکاریوں کو دیکھ کر اپنا سر ریت میں چھپالیتا ہے

نہج البلا

دُنیا اور آخرت میں توازن

دنیا میں انسان مختلف رویوں اور مختلف میلانات کے مالک ہوتے ہیں۔ ان رویوں میں ایک رویہ تو ان لوگوں کا ہے جو دنیا کے کاروبار میں یوں غرق ہو جاتے ہیں کہ انہیں آنے والے وقت کا احساس ہی نہیں رہتا اور موت کی ابدی حقیقت ان کے ذہن سے فراموش ہو جاتی ہے وہ صرف دنیا ہی کے ہو رہتے ہیں اور جب موت قریب آتی ہے تو پھر خواب غفلت سے بیدار ہوتے ہیں اور اس وقت یہ بیداری بیکار ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ایک گروہ ہمیشہ موت کے خوف اور غم میں مبتلا رہتا ہے اور یوں بے عملی کا شکار ہو جاتا ہے۔ موت کا خیال اُسے یوں جکڑ لیتا ہے کہ وہ ایک قدم بھی آگے بڑھنے کے قابل نہیں رہتا۔ یہ دونوں رویے متوازن زندگی کے لیے نقصان دہ ہیں۔ چاہے یہ زندگی فرد کی زندگی ہو یا معاشرے کی۔

جناب امیر علیہ السلام نے اس متوازن زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے جو طریقہ ہمیں سکھایا ہے وہ ان کے اس قول میں موجود ہے۔ کُنْ لِدُنْیَاکَ کَاَنَّکَ تَعِیْشُ اَبَدًا وَکُنْ لِاٰخِرَتِکَ کَاَنَّکَ تَمُوْتُ غَدًا۔ اس قول کا ترجمہ یُوں ہو سکتا ہے کہ تو اپنی دنیا کے ساتھ یوں رابطہ رکھ گویا تو ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور اپنی آخرت کی طرف یوں متوجہ ہو گویا تیری موت کل واقع ہو رہی ہے۔

اس قول میں متوازن زندگی گذارنے کا اصول بتا دیا گیا اور یہی اسلامی رویّہ ہے اسلام میں دین و دنیا کا تضاد موجود نہیں، یہ تضاد اور یہ تصادم دوسرے مذاہب سے ہمارے ہاں آیا ہے۔ جہاں دین اور دنیا میں سے ایک چیز کو اختیار کرنا اور دوسری کو ترک کرنا لازم ہے۔ اسی لیے ان مذاہب میں جو نیک اور پارسا اور خدا رسیدہ بننا پسند کرتے ہیں وہ ترکِ دنیا کر بیٹھتے ہیں اور ان لوگوں کو گھٹیا تصوّر کرتے ہیں جو دین کے مقابلے میں دنیا کو

اختیار کر لیتے ہیں۔ ان مذاہب میں دیندار کے لیے دنیا دار بننا ممکن نہیں اور دنیا دار کے لیے دینداری کی راہ پر چلنا محال ہوتا ہے۔ لیکن اسلام میں یہ بات ناپید ہے۔ ہمارے ہادیٔ مرشد حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو دین و دنیا کو یکجا کرنے کا طریقہ سکھایا ہے اور صاف صاف تلقین کی ہے کہ ترکِ دنیا کا خیال بھی دل میں نہ لاؤ۔ یہ ترکِ دنیا اور یہ رہبانیت اسلام میں روا نہیں ورنہ ہادیٔ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے بڑے تارک الدنیا ہوتے۔ اس کے برخلاف حضور نے بھرپور زندگی گذاری اور دنیا کو اپنے فیوض و برکات سے نوازا۔ اسلام میں اگر تقابل ہے تو دنیا اور آخرت کا ہے۔ قرآن مجید میں بار بار یہ دونوں الفاظ یکجا استعمال ہوئے۔ کسی آیۂ مبارکہ میں ہمیں دین و دنیا کا تقابل نظر نہیں آتا بلکہ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمان کی دنیا اس کا دین ہے اور اس کا دین اس کی دنیا ہے۔ احادیث میں وارد ہوا ہے کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں یا تعلیم کے حصول میں مارا جائے وہ شہید ہے مسلمان کو سکھایا گیا ہے کہ اس کی زندگی کا ہر عمل خدا کے لیے ہے۔ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ العالمین۔ اسی بنا پر اسلام میں خودکشی حرام ہے۔ شادی نہ کرنا کوئی فضیلت نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان تو یہ ہے۔ کہ النکاح مِن سنتی ومن رغب عن سنتی فلیس منی = یعنی شادی کرنا میری سنت ہے اور جو شخص میری سنت سے گریزاں ہو وہ مجھ سے نہیں۔

اس کے ساتھ اسلام نے یہ تلقین بھی کی ہے کہ دنیا کے دھندوں میں یوں نہ پھنس جاؤ کہ آخرت کو بھول جاؤ۔ قرآن مجید کا فرمان ہے۔ لَا تُلْھِکُمْ اولادکم وَلا اموال عن ذکر اللہِ ومن یفعل ذالک فھم فی الاخرۃ من الخسرین۔ یعنی تمہاری اولاد اور اموال تمہیں یادِ خدا سے غافل نہ کردیں اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔

اگر امورِ دنیا ہمیں خدا سے غافل کردیں تو پھر معاشرے کا سارا انتظام ہی دگرگوں ہو جائے۔ جب تاجر احکامِ الٰہیہ کے مطابق تجارت کرتا ہے تو وہ اس کی عبادت ہے لیکن

اگر خدا کو بھول جائے اور احکام خداوندی کی پرواہ نہ کرے تو پھر وہ تجارت کو فروغ دینے کے لیے ہر وہ کام کرے گا جو اُس کی مصلحت کے مطابق ہوں گے۔ چاہے اس میں قوم و ملک کا نقصان ہو یا اس کے مسلمان بھائی پریشان ہوں۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ذخیرہ اندوزی کی شدید مخالفت کی ہے کیونکہ ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری وہی تاجر کرے گا جس کے دِل سے یادِ خدا سفر کر چکی ہو۔ اسی طرح حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی کا ارشاد ہے کہ: الراشی والمرتشی کلاھما فی النار یعنی رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ اور اس کا سبب ظاہر ہے کہ رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا۔ دونوں یادِ خدا سے غافل ہیں۔ اور احکامِ الہٰیہ کو فراموش کرنے والے ہیں یعنی دنیا نے انھیں یوں محو کر دیا ہے کہ انہیں آخرت کا خیال ہی نہیں۔

اس بات کو جناب امیر علیہ السلام نے اپنے بلیغانہ انداز میں اس قول میں پیش کیا ہے وہ ہمیں تلقین کرتے ہیں کہ ہم امورِ دنیا بجا لاتے وقت یوں کام کریں کہ ہمیں ہمیشہ زندہ رہنا ہے یعنی مستقبل کی پوری تیاری کریں۔ صرف آج پر بھروسہ نہ کریں۔ لوگوں سے معاملات کرتے وقت یہ نہ سوچیں کہ کل ہے ہی نہیں، اس لیے آج سے فائدہ حاصل کر لو، اس کے ساتھ آخرت کا خیال یوں رہے گویا کل موت واقع ہو گی۔ یعنی دنیا کی ناپائیداری کا خیال دل سے باہر نہ جائے اور ایک ناپائیدار کے لیے آخرت کا خسارہ نصیب نہ ہو۔

زُہد

جناب امیر المومنین علیہ السلام نے اپنی تمام زندگی میں اپنے پاس بیٹھنے والوں کو علم و حکمت کے وہ درس دیئے ہیں کہ آج بھی اگر ہم ان پر توجہ کریں تو ان سے ہمارے معاشرے کی بیشمار خرابیاں دُور ہوسکتی ہیں۔ انہوں نے انسانوں کو جو سبق دیئے ہیں ان میں ایک نہایت اہم سبق یہ ہے کہ انسان مادی اشیاء کے حصول میں اپنی زندگی وقف نہ کردے بلکہ وہ اشیاء اس لیے حاصل کرتے کہ اس کی زندگی اپنے مقاصد کو حاصل کرے۔ ظاہر ہے کہ مسلمان کی زندگی کا مقصد تمام انسانوں کی فلاح وبہبود اور اپنے لیے اس زندگی کو آخرت کی کھیتی سمجھنا ہے بدقسمتی سے ہم میں سے بیشتر لوگ اس حقیقت سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ تو ایسا ہے جو ساری عمر مال جمع کرنے میں مصروف کردیتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد وہ مال اس کے وارث اڑاتے ہیں۔ یا پھر وہ گروہ ہے جو مال سے بالکل نفرت کرتا ہے اور راہبانہ زندگی گذارنے کو بہتر سمجھتا ہے لیکن یہ اسلامی طریقہ کار نہیں ہے۔ اسلام کا راستہ تو ان کے بین بین کا راستہ ہے حضرت علی علیہ السلام نے اس سلسلہ میں واضح اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے۔ کہ

"لیس الزهد أن لا تملك الشيئ ولكن الزهد أن لا يملك الشيئ"

یعنی زھد یہ نہیں کہ تیرے پاس کوئی چیز ہی نہیں بلکہ زہد تو یہ ہے کہ چیزیں تجھے اپنا غلام نہ بنالیں۔ جناب امیر نے اس مطلب کو اپنے خطبات میں اور مکاتیب میں بار بار اپنے انداز میں دہرایا ہے اور ہمیں اس طرف متوجہ کیا ہے کہ ہم درمیان کی راہ اختیار کریں حصول مال کو وسیلہ سمجھیں مقصد نہ بنالیں۔

انہوں نے اپنے ایک دوست اور ساتھی کمیل ابن زیاد سے ایک طویل گفتگو

میں ارشاد فرمایا ہے۔

"یا کمیل، هلك خزان الاموالِ وهم أحياءٌ، والعلماء باقون ما بقي الدهرُ - اعيانهم مفقودة وامثالهم في القلوب موجودة"

اس کا ترجمہ یوں ہو سکتا ہے

"اے کمیل، مال کے جمع کرنے والے ہلاک ہو گئے حالانکہ یوں دیکھنے کو وہ زندہ ہیں اور جو علماء ہیں وہ اس وقت تک باقی ہیں جب تک یہ زمانہ باقی ہے اور یوں آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن ان کی تصویر مثالی دل میں جاگزیں ہوتی ہے۔"

اس قول میں مادی دولت جمع کرنے والوں کے لیے جناب امیر نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ قابلِ غور ہیں۔ یعنی ہر چند وہ لوگ زندہ ہیں لیکن ہلاک شدگان میں ہوتے ہیں کیونکہ وہ زندگی کے اصل مقاصد کو بھول جاتے ہیں اور مال کو اصل مقصد سمجھ لیتے ہیں حالانکہ مال تو ایک وسیلہ ہے جس کے ذریعے سے دوسری ضروریاتِ زندگی پوری کی جاتی ہیں لیکن جب مال کو مقصد سمجھ لیا جائے تو انسان دوسری ضروریات زندگی کو بھول جاتا ہے اور یوں چلتی پھرتی لاش بن جاتا ہے لیکن اہلِ علم اپنے علم کو کام میں لاتے ہیں اور لوگوں کو اس سے مستفید کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے اس دنیا سے سفر کرنے کے بعد بھی لوگوں کو انکے علم سے راہنمائی حاصل ہوتی ہے اور یوں وہ مرنے کے باوجود ان کے دلوں میں بستے ہیں۔

اس قول کے ذریعے سے جناب امیرؑ نے ہمیں جو سبق دیا ہے وہ یہ نہیں کہ ہم مال سے گریز کریں بلکہ یہ ہے کہ ہم مال کو حاصل کریں اور پھر اسے صرف بھی کریں تاکہ وہ مال ہمارے لیے ترقی کا سبب بنے راستے کا پتھر نہ بنے۔

زہد کی تعریف

ہماری زبان میں اور ہر زبان میں بعض کلمات دن رات استعمال ہوتے ہیں لیکن کوئی شخص ان کے معانی پر غور نہیں کرتا اور اکثر اوقات انھیں ایسے مفہوم میں برتا جاتا ہے جس کا ان کے اصل معانی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان کلمات میں ایک لفظ " زہد " بھی ہے۔ عام طور پر زہد سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ انسان کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور نہ وہ کسی چیز کے حصول کی خواہش کرے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے ہاں زاہد کو فقیر، تنگدست اور محتاج کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ بات اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے ہاں درست ہو لیکن اسلام اس قسم کے زہد کا قائل نہیں جس میں انسانی معاشرے پر بوجھ بن جائے۔ آیئے اس سلسلہ میں باب مدینۃ العلم سے رجوع کریں اور دیکھیں کہ حضرت علی علیہ السلام زہد کے بارے میں کیا ارشاد فرماتے ہیں جب ایک شخص نے ان سے زہد کی تعریف چاہی تو انہوں نے فرمایا۔

اَلزُّهْدُ كُلُّهُ بَيْنَ كَلِمَتَيْنِ مِنَ الْقُرْآنِ قَالَ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَمَنْ لَمْ يَأْسَ عَلَى الْمَاضِي وَلَمْ يَفْرَحْ بِالْآتِي فَقَدْ أَخَذَ الزُّهْدَ بِطَرَفَيْهِ۔

یعنی: زہد کا پورا مفہوم قرآن مجید کے دو کلمات میں سمایا ہوا ہے خداوند عالم کا ارشاد ہے "تاکہ تم اس بات پر افسوس نہ کرو جو تم سے چھن گئی اور اس پر فرحت کا اظہار نہ کرو جو تمہارے پاس آرہی ہے"۔ اس طرح جس شخص نے ماضی پر اظہار تاسف نہ کیا اور آنیوالے دور پر اظہار فرحت نہ کیا اس نے زہد کو ابتداء سے انتہا تک حاصل کرلیا ـــــــ اس قول کے مطابق زہد یہ نہیں کہ انسان کے پاس کچھ ہو ہی نہیں بلکہ یہ کہ انسان ان چیزوں پر افسوس نہ کرے جو اس سے چھن جائیں اور اگر کسی شے کے حاصل ہونے کی توقع ہو تو اس پر خوشی کے مارے آپے سے باہر نہ ہو جائے گویا اشیاء سے ایک قسم کی لاتعلقی پیدا کرلے اس قسم کا رویہ پیدا ہو جائے تو پھر انسان اپنی تمام تر توجہات اشیاء

کے حصول پر صرف نہیں کرتا اور اس دوڑ میں شریک نہیں ہوتا جس میں لوگ طلب دنیا میں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے پر آمادہ ہو جاتے۔ اس طلب منفعت کی یہ خواہش انسانی معاشرے میں بیشمار اجتماعی اور انفرادی برائیوں کا سبب بنتی ہے اسی لیے مختلف ادیان نے اپنے ماننے والوں پر زور دیا ہے کہ وہ کسی شے کے حصول کی خواہش نہ کریں اور اپنے پاس کچھ رکھیں ہی نہیں۔ لیکن اسلام فطرت انسانی کی نفی نہیں۔ ضروریات زندگی کا حصول انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس تقاضے کو پورا کرنا ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے۔ اب اگر انسانوں سے یہ کہا جائے کہ کوئی شے حاصل ہی نہ کرو تو اس کا نتیجہ ایک اجتماعی فالج ہوگا اور کوئی شخص بھی کام نہ کرے گا کیونکہ ضروریات زندگی کے حصول کی خواہش ہی انسانوں میں کام کرنے کی لگن پیدا کرتی ہے اب اگر زہد کا مفہوم یہ لیا جائے کہ انسانوں کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور نہ وہ کسی چیز کے حاصل کرنے کی خواہش کریں اور نہ کوشش، تو پھر معاشرہ مفلوج ہو کر رہ جائے۔ مگر اسلام تو معاشرے کی بہبود اور ترقی کا ضامن ہے اس لیے اس میں اس قسم کے زہد کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسلام تو اپنے ماننے والوں کو یہ تلقین کرتا ہے کہ خوب جی لگا کر کام کرو، کماؤ۔ خود کھاؤ اور دوسروں کو کھلاؤ۔ اسی لیے حضرت علیؑ نے زہد کی تعریف میں یہ نہیں فرمایا۔ کہ انسان کچھ حاصل ہی نہ کرے بلکہ یہ کہ وہ اشیاء کے حصول ہی کے لیے وقف ہو جائے۔ جب انسان اپنی خوشیوں اور غمیوں کی بنیاد چیزوں کے حصول اور نقصان پر نہ رکھے تو وہ زہد اختیار کر لیتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک مقام پر حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ:۔

لَيْسَ الزُّهْدُ أَنْ لَا تَمْلِكَ الشَّيْءَ وَلٰكِنَّ الزُّهْدَ أَنْ لَا يَمْلِكَكَ الشَّيْءُ۔

یعنی زہد یہ نہیں کہ تم کسی شے کے مالک نہ بنو بلکہ یہ ہے کہ کوئی شے تمہاری مالک نہ بن جائے۔

دوستی کی اہمیّت

انسانی معاشرے کی تشکیل اور بقا اس بات کی مرہونِ منت ہے کہ افراد معاشرہ آپس میں تعاون اور اتفاق سے کام لیں اور اجتماعی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے ذاتی خواہشات کو کسی حد تک قربان کریں۔ کیونکہ اگر ہر فرد اپنی خواہشات کی تکمیل کرنا چاہے اور یہ خیال نہ کرے کہ اس جیسے دوسرے افراد بھی اس کے گرد و پیش بستے ہیں اور ان کی بھی خواہشات ہیں تو پھر انانیت کو فروغ حاصل ہوگا اور اجتماعی زندگی کے تار و پود بکھر جائیں گے۔ لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ فرد اور اجتماع کے مابین روابط میں توازن پیدا کیا جائے تاکہ نہ تو فرد کی ذات کو نقصان پہنچے اور نہ فرد کی انا کی بے حد و حساب پرورش کی بنا پر معاشرے پر زد پڑے۔

اس سلسلہ میں جناب امیرالمومنین علیہ السلام بین الافراد تعلقات کے بارے میں ایک قول میں ارشاد فرمایا کہ:-

خَالِطُوا النَّاسَ مُخَالَطَةً إِنْ مِتُّمْ بَكَوْا عَلَيْكُمْ وَإِنْ عِشْتُمْ حَنُّوا إِلَيْكُمْ۔

یعنی، لوگوں سے یوں مل جل کہ اگر تمہاری موت واقع ہو جائے تو وہ تم پر روئیں اور اگر زندہ رہو تو تم سے ٹوٹ کر محبت کریں۔

اس قول میں جناب امیر علیہ السّلام نے فرد کو یہ تلقین کی ہے کہ وہ اپنے معاشرے کے افراد کے ساتھ باہمی محبت کے روابط استوار کریں تاکہ تمہاری زندگی میں وہ تمہاری محبّت کے متلاشی ہوں اور موت کی صورت میں انہیں تمہارا فقدان محسوس ہو۔ اس قسم کے روابط صرف اسی وقت پیدا ہو سکتے ہیں جب فرد اپنے معاشرے کے دیگر افراد کو یہ یقین دلائے کہ وہ ان کے لیے مفید ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان اساسی طور پر انانی ہے اور وہ ان چیزوں سے محبت کرتا ہے جن سے اسے فائدہ حاصل کرنے کی امید ہو۔ اس کے غم اور ملال کا باعث

ہی ہوتا ہے کہ کوئی مفید چیز ان سے چھین لی جائے۔ اب اگر کوئی اپنے معاشرے کے افراد کے ساتھ ایسا سلوک کرے جو ان کو پسند آئے اور احساس دلائے کہ وہ فرد ان کے کام آتا ہے تو نہ صرف وہ اسے زندگی میں پسند کریں گے بلکہ اس کی موت پر انہیں ذاتی نقصان کا احساس ہوگا اگر معاشرے کے تمام افراد یہی وطیرہ اختیار کرلیں تو پھر معاشرے میں باہمی جھگڑے، فساد کا خاتمہ ہو جائے اور وہ معاشرہ درست طور پر ترقی کی راہ اختیار کرلے۔

اس بات کو جناب امیر علیہ السّلام نے ایک اور رنگ میں یوں بیان فرمایا ہے کہ :

أَعْجَزُ النَّاسِ مَنْ عَجَزَ عَنِ اكْتِسَابِ الْإِخْوَانِ وَأَعْجَزُ مِنْهُ مَنْ ضَيَّعَ مَنْ ظَفِرَ بِهِ مِنْهُمْ۔

یعنی: لوگوں میں عاجز ترین شخص وہ ہے جو دنیا میں دوست نہ بنا سکے۔

لیکن اس سے بھی عاجز وہ ہے جو بنائے دوستوں کو کھو بیٹھے۔

اس قول میں اساسی بات افراد کے مابین باہمی تعلقات ہیں۔ انسان فطری طور پر اجتماع پسند ہے۔ وہ اکیلا نہیں رہ سکتا۔ اگر اس کے پاس تمام لوازم حیات بھی ہوں اور اس قابل ہو کہ بغیر کسی کی مدد کے اپنی زندگی گذار سکے تو بھی اس کے جذباتی تقاضے اور نفسیاتی ضروریات اسے مجبور کرتی ہیں کہ اس کے پاس کوئی ہمنوا، کوئی ہم نفس اور کوئی دوست ہو۔ انسان کو اگر شدید ترین سزا دینا ہو تو اسے قید تنہائی میں رکھ دیجئے۔ اس قید تنہائی کے حربے کو جیلوں میں خطرناک مجرموں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی لیے ہم یہ دیکھتے ہیں ہر انسان چاہے اس کی عمر کم ہو یا زیادہ، اپنے اردگرد دوستوں کا ایک حلقہ بنانا چاہتے ہیں۔ جن سے وہ اپنے دل کی بات کہہ سکے اور اپنا دکھ درد بانٹ سکے۔ اور وہ افراد جو اس سے محروم ہوتے ہیں ان میں بے شمار نفسیاتی امراض رونما ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے معاشرے سے بیزار ہو کر بعض اوقات خودکشی تک آمادہ ہو جاتے ہیں اس معاشرتی اور نفسیاتی حقیقت کو جناب امیر علیہ السلام ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں جو ابھی ابھی آپ کی خدمت میں پیش کیے گئے ان کے نزدیک بدنصیب ترین شخص وہ ہے جو کسی کو اپنا دوست نہ بنا سکے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ بدنصیب اس شخص کو شمار کرتے ہیں جو اپنے بنے بنائے دوستوں کو ہاتھ

سے کھو بیٹھے اس کا سبب یہ ہے کہ جو شخص دوست بنا نہیں سکتا۔ اس کا صرف اس بات کا قلق ہوگا کہ وہ دنیا میں اکیلا ہے اور اسے اپنے دل کی بات کہنے کے لیے کوئی ہم سخن نہیں ملتا۔ لیکن وہ شخص دوہری شکل میں مبتلا ہوتا ہے جو دوست بنانے کے بعد ان کو گنوا بیٹھے۔ اسے ایک غم اکیلا پن کا ہوتا ہے اور دوسرا غم اس بات کا کہ اسکے اچھے بھلے دوست اس کے ہاتھ سے جاتے رہے جن کو اس کے بے شمار راز معلوم ہیں اور ممکن ہے کہ اب وہ دشمنی کی بنا پر وہ راز ان لوگوں تک پہنچا دیں، جن تک نہیں پہنچنا چاہیں۔ اسی لیے جناب امیرؑ علیہ السلام ہمیں اپنے قول میں تلقین فرماتے ہیں کہ دوستی اور دشمنی میں توازن اور اعتدال سے کام لیں کیونکہ امکان اس بات کا ہے کہ دوست کسی وقت دشمن بن جائے اور دشمن سے دوستی کا رشتہ استوار ہو۔ ان دونوں صورتوں میں اگر اعتدال سے کام نہ لیا گیا ہو۔ تو انسان بڑی الجھنوں میں گرفتار ہو سکتا ہے۔

غنی کون ہے

جن موضوعات پر جناب امیر علیہ السلام نے متواتر ارشاد فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک موضوع غنیٰ ہے۔ اردو میں ہم غنی کے لفظ سے عام طور پر امیر آدمی مراد لیتے ہیں لیکن عربی میں غنی کے معنی دولت مندی کے نہیں بلکہ اس سے عدم احتیاج کا مفہوم نکلتا ہے تو گویا غنی وہ شخص ہے جو دوسرے لوگوں کا محتاج نہ ہو اور اس کے مقابلہ میں فقیر وہ ہے جو دوسروں کا محتاج ہو۔ لہذا غنیٰ کا تعلق دولت سے نہیں بلکہ ایک داخلی کیفیت سے ہے جو انسان کو دوسروں کا محتاج نہیں ہونے دیتی۔ آج ہم اسی موضوع کے بارے میں جناب امیرؑ کا ایک قول پیش کر رہے ہیں جس میں انہوں نے ارشاد فرمایا ہے:۔

الغِنیٰ الأَکبَرُ أَلیَأسُ عَمَّا فِی أَیدِی النَّاسِ

یعنی سب سے بڑا غنیٰ یہ ہے کہ انسان کو اس چیز سے کسی قسم کی توقع ہی نہ رہے۔ جو لوگوں کے پاس ہے، دوسرے لفظوں میں غنی وہ ہے جسے دوسروں کے پاس کی اشیاء کا خیال ہی نہ آوے۔

اب ذرا اپنے آپ پر اور اپنے گردوپیش کے لوگوں پر نگاہ ڈالیے اور اس بات کا تجزیہ فرمایئے کہ ہماری محتاجی اور ضرورت مندی کی بنیاد کس بات پر ہے؟ آپ کو اس نتیجہ پر پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوگی کہ ہماری محتاجی کا براہ راست تعلق ہماری ضروریات سے ہے۔ یہ ضروریات دو طرح کی ہوتی ہیں ایک تو اساسی اور بنیادی ضروریات ہیں جن کے بغیر انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا ہے مثلاً خوراک۔ اور پھر وہ ضروریات ہیں جن کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے یعنی جس کے پورا نہ ہونے کے باوجود انسان زندہ رہ سکتا ہے۔ مثلاً نہایت اعلیٰ درجہ کی موٹر گاڑی کا ہونا۔ جوں جوں ہماری ضروریات بڑھتی جاتی ہیں ہماری محتاجی کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے جس قدر ضروریات کم ہوں گی ہماری محتاجی میں کمی ہوتی جائے گی۔ اب غنی مطلق تو وہی ہو سکتا ہے جس کی ذات کو کسی شے کی ضرورت ہی نہ ہو اور یہ ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ ہم انسان نسبتاً غنی یا فقیر ہو سکتے ہیں یعنی جس

قدر ہمیں اپنی ضروریات کے حصول میں دوسروں کا دستِ نگر نہ ہونا پڑے۔ اسی قدر ہم غنی ہو سکتے ہیں۔ دوسروں کی محتاجی سے بچنے کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم میں اتنی طاقت ہو کہ ہم اپنی ضروریات کو خود پُورا کر سکیں اور ان کے لیے ہم دوسروں کے محتاج نہ ہوں لیکن ایسا ہونا محال ہے کیونکہ زندگی کے ہر مرحلے پر ہمیں دوسروں کی مدد درکار ہوتی ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ضروریات ہی نہ رہیں جو ہماری محتاجی کا باعث بنتی ہیں۔ اب اتفاق سے یہ بات بھی ممکن نہیں کہ کسی انسان کو زندگی میں کسی چیز کی ضرورت ہی نہ ہو۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان۔ کے لیے ہر اعتبار سے غنی ہونا ممکن ہی نہیں۔ البتہ یہ بات ضرور ممکن ہے کہ ہم نسبی یا اضافی طور پر غنی ہوں۔ یعنی اپنی ضروریات کو کم سے کم بنا کر دوسروں کے کم سے کم محتاج ہوں۔ اب ذرا ضروریاتِ زندگی پر منظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ان ضروریات سے قطع نظر جو ہر انسان کو اساسی طور پر پیش آتی ہیں۔ ہماری بیشتر ضروریات دوسروں کی دیکھا دیکھی میں پیدا ہوتی ہیں۔ ہم اپنے ساتھ کے لوگوں کے پاس اپنے سے زیادہ اور بہتر چیزیں دیکھ کر اپنے اندر ایک کمی محسوس کرتے ہیں اور یوں ان چیزوں کے حصول کی خواہش دل میں جنم لیتی ہے اور پھر ان چیزوں کی ضرورت ہمیں دوسروں کا محتاج بنا دیتی ہے اس طرح دوسروں کو دیکھ دیکھ کر ہم اپنے آپ کو محتاج سے محتاج تر بناتے چلے جاتے ہیں لیکن وہ انسان جو دوسروں کی چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا نہ ان کی خواہش کرے گا نہ ان کی ضرورت محسوس کرے گا اور نہ یوں اپنی محتاجیوں میں اضافہ کرے گا۔ جناب امیرؑ کا جو قول آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے اس کا مفہوم یہی ہے کہ غنی تو وہ ہے جو دوسروں کے پاس موجود چیزوں کے حصول کی تمنا ہی نہ کرے۔ اس بات کو جناب امیرؑ نے ایک اور مقام پر یوں ادا کیا ہے کہ:

اَشْرَفُ الْغِنٰی تَرْکُ الْمُنٰی

یعنی سب سے اچھا غنی تو یہ ہے کہ انسان اپنے دل میں خواہشات ہی پیدا نہ ہونے دے، یہ رویہ ایک بے نیازی کا رویہ ہے اور جوں جوں یہ بے نیازی بڑھتی ہے توں توں انسان غنی سے غنی تر ہوتا چلا جاتا ہے اور اسی طرح اس بے نیازی میں کمی انسان کی محتاجی اور فقر میں اضافہ کرتی چلی جاتی ہے۔ اس بات کو حضرت علی علیہ السلام سے منسوب

ایک شعر میں نہایت خوبصورتی سے ادا کیا گیا ہے۔ ؎

اِنَّ الْغِنِيَّ هُوَ الْغَنِيُّ بِقَلْبِهٖ
لَيْسَ الْغَنِيُّ بِمَالِهٖ وَمَنَالِهٖ

یعنی غنی تو وہ ہے جو دل سے غنی ہے کیونکہ مال و دولت سے انسان غنی نہیں بن سکتا۔

عدل ۱

عدل، انسانی معاشرے کی تشکیل، استمرار اور بقا کے لیے سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اگر افرادِ معاشرہ کو ان کے حقوق کی ضمانت نہ دی جائے اور انھیں اس امر کا یقین نہ ہو کہ اگر کوئی فرد کسی بھی بنا پر ان کے حقوق غصب کرے تو معاشرتی نظام انہیں تحفظ فراہم کرے گا تو پھر وہ معاشرتی عمل میں دلجمعی سے شریک نہ ہو سکیں گے۔ اسی لیے ہر معاشرے نے کم از کم نظری طور پر عدل و انصاف کو اپنایا ہے لیکن اسلام نے عدل کو صرف اپنایا نہیں بلکہ اسے اپنے نظام میں قدرِ اعلیٰ کی حیثیت دی ہے۔ اسلام میں قرآن مجید کے الفاظ میں افضلیت کا معیار تقویٰ ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اور تقویٰ کی منزل پر پہنچنے کے لیے عدل کا راستہ اختیار کرنا لازم آتا ہے اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی اس لحاظ سے عدل کو اسلامی تعلیمات میں بے حد اہمیت حاصل ہے۔

جناب امیر علیہ السلام بھی اپنے خطبات اور مکتوبات میں عدل پر بے حد زور دیتے ہیں اور بیشمار اقوال میں انھوں نے عدل کی ضرورت کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک شخص نے ان سے سوال کیا کہ العدل افضل ام الجود یعنی عدل افضل ہے یا سخاوت؟ یہ دونوں باتیں انسان کے لیے اہم ہیں۔ بظاہر اس سوال کا جواب یہی ہونا چاہیئے کہ سخاوت افضل ہے کیونکہ عدالت تو دوسروں کے حقوق کا اعتراف اور ان کی حفاظت کا نام ہے جبکہ سخاوت یا جود کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے حقوق اپنے ہاتھوں دوسروں کے لیے قربان کر دے لیکن جناب امیر علیہ السلام اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں العدل یضع الامور مواضعہا والجود یخرجہا من جہتہا العدل سائس عام والجود عارض خاص فالعدل اشرفہا و افضلہما یعنی عدل اشیاء کو

اپنے مقام پر رکھتا ہے اور سخاوت ان چیزوں کو ان کے اپنے مقام سے خارج کرتی ہے۔ عدل کا اطلاق عمومی طور پر ہوتا ہے اور یہ ہر بات کو اپنے دائرے میں لے آتا ہے جب کہ سخاوت ایک مخصوص اور استثنائی حالت ہے اس لیے عدل سخاوت سے بہتر ہے۔

یوں جناب امیر علیہ السلام عدل کو سخاوت پر ترجیح دیکر اشارہ فرماتے ہیں۔ کہ اجتماع فرد سے مقدم ہے اور اجتماعی مفاد انفرادی منفعت سے بہتر۔ سخاوت سے ایک فرد کو فائدہ حاصل ہوتا ہے لیکن عدل سے پورے معاشرے کو حضرت علی علیہ السلام کی نگاہ میں وہ اصول جو اجتماعی توازن کو برقرار رکھ سکتا ہے اور تمام افراد معاشرہ کو سکھ پہنچا سکتا ہے، عدل کا اصول ہے اس کے مقابلے میں ظلم یا جو خود ظالم یا جابر کے ضمیر کو بھی سکھ نہیں دے سکتا۔ حضرت علی علیہ السلام نے بیت المال کی تقسیم کے بارے میں ایک شخص سے کہا کہ اگر یہ مال میرا اپنا ہوتا تو بھی میں اس کی تقسیم برابر کرتا۔ اور بیت المال تو خدا کا مال ہے اس میں میں کیونکر برابری کا اصول نہ برتوں۔ اسی طرح ایک اور شخص کے سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا۔ کہ الحق القدیم لایبطلہ شیئ۔ یعنی قدیم حق کو کوئی شے باطل نہیں کرسکتی۔ یہ نہیں کہ ہم کسی کی ملکیت پر قبضہ مخالفانہ کر بیٹھیں اور کچھ وقت گذرنے پر قانون اصلی مالک کو اس کے حق سے محروم کردے۔

عدل کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام کا نقطۂ نظر اسلامی تعلیمات کی روح کی آئینہ داری کرتا ہے اور وہ بار بار ہمیں عدل کی راہ پر چلنے کی تلقین فرماتے ہیں اور ظلم سے گریز کرنے کا سبق دیتے ہیں۔ ایک جگہ انہوں نے متقی کی خصوصیات بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ قد الزم نفسہ العدل فکان اول عدلہ نفی الھوی عن نفسہ۔ یعنی اس نے اپنے آپ کو عدل کے ساتھ لازم کرلیا اور اس کے عدل کی ابتدا یہ ہے کہ اس نے نفس کے خواہشات کی نفی کردی۔ یہ بات تو فرد کے بارے میں تھی۔ اجتماعی عدل کے بارے میں ان کا ارشاد ہے ان افضل قرۃ عین الولاۃ استقامۃ العدل فی البلاد۔ یعنی حاکموں کی آنکھوں کی ٹھنڈک پیدا کرنے والی باتوں میں افضل ترین امر ملک میں عدل و انصاف

کا قیام ہے۔ اس کا سبب ظاہر ہے کہ جب ملک میں عدل کا دور دورہ ہو گا۔ تو پھر لوگ چین سے زندگی گذاریں گے اور حاکم بھی چین سے سو سکیں گے۔ اجتماعی عدل کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ جناب امیر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ الملک یبقیٰ مع الکفر ولا یبقی مع الظلم یعنی مملکتیں کفر کے ساتھ تو باقی رہ سکتی ہیں۔ لیکن ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتیں۔

عدل ۲

انسانی معاشرے میں قانون کی ضرورت یوں پیدا ہوتی ہے کہ اس کے وسیلے سے ہم افراد کے حقوق کی حفاظت کر سکتے ہیں اور انحراف کرنے والوں کو سزا دے سکتے ہیں۔ دنیا کے دیگر مذاہب کے برخلاف اسلام میں قانون سازی اور قانون کی عمل درآمد پر بے حد زور دیا ہے۔ دورِ جدید کا یہ تصور کہ معاشرے میں قانون کی حکومت ہونا چاہیئے اور کوئی شخص قانون سے بالاتر نہ ہو، اصل میں اسلام ہی کا فیضان ہے کہ تاریخ انسانیت میں پہلی بار اسلام میں یہ تصوّر پیش کیا اور رائج کیا۔ قانون کی حکومت کے ساتھ ہی ساتھ عدالتوں اور ان میں استعمال کیئے جانے والے طریقے کا مسئلہ بھی آتا ہے یعنی یہ بات اہمیّت اختیار کر جاتی ہے کہ قانون کا نفاذ کرنے اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو کس طریقے سے سزا دینے کا عمل جاری کیا جائے انصاف جہاں یہ تقاضا کرتا ہے کہ مظلوم کو جلد داد رسی حاصل ہو۔ وہاں یہ بھی ضروری بات ہے کہ انصاف دیتے وقت کسی بے گناہ کو سزا نہ مل جائے۔ یہ مسائل ہر معاشرے کو درپیش رہے ہیں اور ہمیں بھی ان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

جناب امیر علیہ السّلام نے اپنے خطبات اور مکاتیب میں جہاں اور مسائل سے بحث کی ہے وہاں عدل کے بارے میں بھی خالص اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کا ایک قول ہمارے سامنے ہے کہ:۔

"لیس من العدل القضاء علی الثقه بالظن"

یعنی ظن و گمان پر بھروسہ کر کے فیصلہ کرنا عدل نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ قاضی اس وقت تک فیصلہ نہیں کر سکتا جب تک اسے واضح طور پر یقین حاصل نہ ہو جائے کہ اس کے سامنے جو ثبوت پیش کئے گئے ہیں یا جو شہادتیں گذاری گئی ہیں ان میں کسی

قسم کی کوئی فیہ نہیں ہے اور شکوک و شبہات سے بالا تر ہیں۔ یہ اصول جدید قانون میں بھی تسلیم کیا جاتا ہے اور کہے سنے کی شہادت کو قبول نہیں کیا جاتا۔ اس بنیاد پر ملزم کو پورا حق ہے کہ وہ اپنے خلاف پیش ہونے والی شہادت کی اچھی طرح چھان پھٹک کرے اور گواہ پر جرح کر سکے تاکہ اسے بعد میں یہ تصور نہ ہو کہ اس کے خلاف جو شہادتیں پیش کی گئیں ان میں کوئی نقص تھا۔ جناب امیرؑ کے نزدیک ایسے گواہوں پر بھروسہ کرنا اور ایسے گواہوں کے بیانات پر اعتماد کرنا جن میں شک کا معمولی سا شائبہ بھی ہو، عدل کے تقاضوں کے برخلاف ہے۔ یہ بات قاضی کے فرائض میں آتی۔ کہ وہ جن گواہوں کے بیانات پر اعتماد کر کے فیصلہ کر رہا ہے۔ اسے ان کے بارے میں ایسا یقین حاصل ہو۔ جس پر حرف گیری نہ کی جا سکے۔ کیونکہ اگر قاضی نے مشکوک شہادتوں پر اعتماد کیا تو وہ غلط فیصلہ کر دے گا۔ جس سے یا تو کوئی شخص حقوق سے محروم ہو جائیگا یا مفت میں سزا پا جائے گا۔ اسی لیے جناب امیر علیہ السلام ہی نے ایک اور مقام پر امام جعفر صادق علیہ السلام کی روایت کے مطابق قاضیوں کی چار قسمیں بتائی ہیں۔ ایک وہ قاضی ہے جو غلط فیصلہ کرتا ہے اور اسے معلوم نہیں کہ اس نے غلط فیصلہ کیا۔ دوسرا وہ ہے جس نے صحیح فیصلہ کیا لیکن اسے خبر نہیں کہ اس نے صحیح فیصلہ کیا۔ تیسرے وہ ہے جس نے غلط فیصلہ دیا اور اسے معلوم ہے کہ اس نے غلط فیصلہ دیا اور چوتھے وہ ہے جس نے صحیح فیصلہ دیا اور اسے معلوم ہے کہ اس نے درست فیصلہ دیا۔ ان میں سے صرف آخری قسم اسلامی عدالت کے معیار پر اترتی ہے، یعنی وہ قاضی جو صحیح فیصلہ دے اور پتہ ہو کہ اس نے درست فیصلہ دیا ہے اور یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک قاضی ایسی شہادتوں پہ اعتماد کرے جن میں کسی شک کی گنجائش نہ ہو۔

بہترین عدل

جناب امیر علیہ السلام کا ایک قول ہے اَحْسَنُ الْعَدْلِ نُصْرَۃُ الْمَظْلُوْمِ یعنی عدل کی بہترین شکل مظلوم کی نصرت کرنا ہے اس میں بظاہر ایک عجیب سی بات دکھائی دیتی ہے۔ اور وہ یہ کہ آخر مظلوم کی مدد کا عدل سے کیا تعلق ہے لیکن اگر عدل کا وہ مفہوم ذہن میں رہے جو عربی میں ہے تو پھر اس قول پر تعجب نہ ہوگا۔ عربی میں عدل کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کے مناسب پر رکھنا اور جب ہم اس چیز کو غیر مناسب جگہ رکھیں تو اسے ظلم کہتے ہیں۔ جب کوئی جج کسی مجرم کو اس کے ثابت شدہ جرم کی بنا پر سزا دیتا ہے تو وہ ظلم نہ ہوگا۔ کیونکہ اگر مجرم کو سزا نہ دی جائے تو دوسروں کو قانون شکنی کا حوصلہ ہوگا۔ یہ سزا اگرچہ عام آدمی کو بڑی سخت معلوم ہو لیکن معاشرے کے اجتماعی مفاد کے پیش نظر اسے سزا نہ دینا تمام افراد معاشرہ کے ساتھ ظلم ہوگا۔

اسلام میں عدل کو بڑی اہمیت دی گئی۔ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق اسلامی معاشرہ میں افضل وہ شخص ہے جو زیادہ متقی ہو اور قرآن مجید ہی کا ارشاد ہے کہ عدل سے کام لو کیونکہ وہ تقویٰ کے نزدیک تر ہے۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ عدل کے بغیر انسان متقی نہیں ہو سکتا۔ اس کا سبب ظاہر ہے کہ عادل شخص تمام اعمال کو عدل کے تقاضوں کے مطابق سرانجام دیتا ہے یعنی اس وقت وہ عمل کرتا ہے جب وہ موقع کے مناسب ہو۔ میدان جنگ میں دشمنوں کے لیے شدت کا اظہار کرتا ہے اور مومن بھائیوں کے ساتھ نرمی اور لطف کا سلوک کرتا ہے۔ قرآن مجید نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماننے والوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کے الفاظ استعمال کیے۔ اب اگر کوئی مومن کافروں سے نرمی کا سلوک کرے اور دوستوں کے ساتھ سختی برتے تو عین ظلم ہوگا اور اس کے ساتھ حکم خدا کی خلاف ورزی بھی جو سب سے بڑا ظلم ہے۔

جب ہم مظلوم کی مدد کرتے ہیں تو ایک طرح کا فیصلہ کرتے ہیں پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ آیا وہ مظلوم ہے یا نہیں اور وہ کون ہے جس نے اس پر ظلم کیا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ظلم کی نوعیت کیا ہے، مقدار کتنی ہے تاکہ اس کے مطابق سزا دی جائے، جب ان باتوں کو اچھی طرح پرکھ لیتے ہیں تو پھر مظلوم کی مدد کا فیصلہ کرتے ہیں۔ گویا اس وقت ہم جج کے فرائض سرانجام دے رہے ہوتے ہیں اگر ہم نے درست فیصلہ کیا تو عدل کیا ورنہ ظلم، اگر ہم پر مظلوم کی مظلومی ثابت ہوگئی تو اب عدل اور تقویٰ کے تقاضوں کے مطابق اس کی مدد کرنا ہمارا فرض ہو جائے گا۔ لیکن اگر ہم نے مظلومی کے ثابت ہونے پر بھی اس کی مدد نہ کی تو گویا ظالم کی ہمنوائی کی اور یوں ظلم کیا اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام کا یہ قول بھی قابلِ غور ہے کہ جو شخص کسی قوم کے کسی بُرے کام پر راضی ہُوا تو گویا وہ اس کام میں شریک ہے اور اس کے دو گناہ ہیں۔ ایک کام کرنے کا گناہ اور دوسرا اُس پر رضامندی کے اظہار کا۔ اسی طرح حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس بات کا اظہار ہے کہ اگر کوئی بُرائی ہو رہی ہو تو اس کے خلاف جہاد کرو۔ اگر ہاتھ سے نہیں کر سکتے تو زبان سے کرو۔ اور اگر زبان سے بھی اس بُرائی کے خلاف جہاد نہ کر سکو تو پھر دل سے برا جانو۔ اگر ہم برائی کو برائی سمجھ کر خاموش رہیں تو گویا ہم برائی کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں اور اسی طرح اچھی بات کو اچھا سمجھنے کے باوجود اگر ہم اس کا ساتھ نہ دیں اور اس کی مدد نہ کریں تو گویا ہم اچھائی کی دل شکنی کر رہے ہیں، اگر ہم چور کو سزا نہ دیں تو دوسروں کو بھی چوری کرنے کا حوصلہ ہوگا اور اگر نیک کو اس کے اچھے کاموں پر جزا نہ دیں تو دوسروں کو نیک کام کرنے کا خیال نہ آئے گا۔ یہ دونوں باتیں ظلم ہوں گی۔ کیونکہ ہمارے غلط فیصلے سے پورا معاشرہ متاثر ہوگا۔ قرآن مجید میں جھوٹے گواہی دینے کم تولنے اور اسی قسم کے دوسرے کاموں کی جو مذمت کی گئی تو اس کا سبب یہی ہے کہ ایسے کام عدل کے تقاضوں کے خلاف ہیں اور یوں ظلم ہیں اور خداوند عالم ظالموں کو پسند نہیں کرتے۔ اس بنا پر اسلام میں مجرموں کو سخت سزائیں دی جاتی ہیں اور دوسروں کو ویسے کام کرنے کا حوصلہ نہ ہو۔ یہ سزائیں ظلم نہیں بلکہ عین عدل ہیں۔ اسی طرح اگر ہمیں اچھے اور بُرے کا پتا ہو اور یہ طے نہ کریں، کہ

اچھے کا ساتھ دیں یا برے کا اور گومگو کے عالم میں پڑے رہیں تو ظلم ہوگا۔ اسی احکام کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ہم بہ آسانی اس نتیجے پر وارد ہو سکتے ہیں کہ یہ تمام احکام عدل کی اساس پر دیئے گئے ہیں اسی لیے ہمارے معاشرے میں عادل کی بڑی توصیف کی جائے۔ پیش نماز کے لیے عدالت شرط ہے، حاکم کے لیے عادل ہونا شرط ہے۔ قاضی کے لیے عادل ہونا شرط ہے۔ مختصر یہ کہ مسلمان کو ہر کام میں عدل سے کام لینے کا حکم ہے، یہاں تک کہ کھانے پینے میں بھی۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی ایک دعا میں ارشاد فرمایا ہے۔ خدا اس شخص پر رحم کرے جس نے اپنی آرزوؤں کو کم کر دیا ہو۔ موت کے لیے تیار ہو، موقع و فرصت کو غنیمت جانے، حق کو زندہ کرے، باطل کو مٹائے ظلم کو ختم کرے اور عدل کو قائم کرے۔

اس جملے سے بھی عدل کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے اگر ہم مسلمان اپنے معاشرے میں قیام عدل پر تیار رہوں تو تمام برائیاں خود بخود ختم ہو جائیں۔ اور سب مسلمان انسانیت کو صراط مستقیم کی طرف بلانے پر قادر ہو جائیں۔

تغیّر کی اہمیّت

انسانی زندگی میں بعض باتیں انسان کے لیے پریشانی کا موجب ہوتی ہیں۔ ان باتوں میں ایک یہ ہے کہ انسان ایک خاص حالت میں پڑا رہنا چاہتا ہے اور اسے اپنے آپ کو بدلنے میں کوفت ہوتی ہے اگر اس کا بس چلے تو شاید تمام عمر آرام و سکون میں گذارنا پسند کرے لیکن اسے جینے کے لیے حرکت کرنا پڑتی ہے اور جوں جوں اس کی عمر بڑھتی ہے توں توں اس میں تبدیلیاں واقع ہوتی جاتی ہیں، تبدیلی زندگی کی اٹل حقیقت ہے، اس سے آنکھیں چرانا ممکن نہیں۔ اس بات کو جناب امیر علیہ السلام نے اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے کہ: كَيْفَ تَبْقٰى فِيْ حَالَتِكَ وَالدَّهْرُ مُسْرِعٌ فِيْ اِحَالَتِكَ یعنی تو اپنی حالت پر کیونکر قائم رہ سکتا ہے جب کہ زمانہ تجھے بدلنے میں سرعت و عجلت سے کام لے رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تبدیلی کو بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں، لیکن ان کی ایک بہت بڑی تعداد اس کو بامرِ مجبوری قبول کر لیتی ہے کیونکہ وہ کچھ اور کر نہیں سکتے۔ پھر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو تبدیلی کا اعتراف ہی نہیں کرتے بلکہ بزعم خود یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں تبدیلی واقع ہی نہیں ہوئی۔ ایک شخص بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جاتا ہے لیکن ابھی اپنے کو نوجوان تصوّر کرتا ہے اور نوجوانوں جیسی حرکتیں اس سے سرزد ہوتی ہیں لوگ اسے مذاق کرتے ہیں اُسے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ لیکن کوئی بات اس پر اثر نہیں کرتی۔ ایسا شخص ذہنی طور پر مریض ہوتا ہے۔ اس کا ذہن بڑھاپے کی حقیقت کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اس قسم کی مثالیں اور بھی مل سکتی ہیں۔ جن میں افراد اور قومیں تبدیلی کو تسلیم نہیں کرتیں اور یوں ایک طرح کی خود فریبی میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔

اس قول میں حضرت علی علیہ السلام صرف اس امر پر زور نہیں دیتے کہ تبدیلی لازمی شے ہے بلکہ ایک انداز میں اس امر پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ بعض لوگ جمود کی حالت

میں رہنا چاہتے ہیں۔ اس بات پہ زور دیا ہے کہ تغیّر تو ہو کر رہے گا اور کوئی شخص اس کو روک نہیں سکتا کیونکہ زمانہ تغیّر کو لانے پر تُلا ہُوا ہے بقول اقبال اس کائنات میں اگر کوئی شے ثبات رکھتی ہے تو وہ تغیّر ہے اس تصور کو قالب اظہار میں لانے کے لیے جناب امیر علیہ السّلام نے استفہام کو استعمال کیا ہے۔ استفہام یعنی سوال پوچھنا بعض اوقات معلوم حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص آپ سے دریافت کرے کہ وقت کیا ہے؟ لیکن یہ سوال بعض اوقات اس لیے بھی پوچھا جاتا ہے کہ دُوسرا شخص کسی بات کا اقرار کرے اس قول میں بھی جناب امیر علیہ السلام نے استفہامی انداز اختیار کیا ہے اور تعجب کے انداز میں پوچھا ہے کہ آخر تم یہ خیال کیونکہ ذہن میں لاتے ہو کہ تم ایک ہی حالت پر رہو گے۔
حالانکہ تمہارے گرد و پیش کی تمام چیزیں بدل رہی ہیں اور دوسری چیزوں کو متغیّر کر رہی ہیں تغیّر کا قانون آفاقی قانون ہے اور کوئی شخص یا چیز اس کے اثر سے باہر نہیں۔ اس لیے جو شخص یہ چاہے کہ ہمیشہ ایک سی حالت میں رہے، ایک ناممکن شے کی تلاش کر رہا ہے۔ اور یوں ناکامی اس کا مقدّر ہے۔ تغیّر کا یہ قانون قرآن مجید میں بھی مختلف انداز میں ہمارے سامنے لایا گیا ہے اور ہمیں احساس دلایا گیا ہے کہ ہم اپنے آپ کو آنے والے تغیرات کے لئے تیار کریں اور ان بدلے ہوئے حالات کا سامنا کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔

تغیّر ایک ایسا مظہر ہے جس سے مفر ممکن نہیں۔ عقلمند لوگ اس تغیّر کو، اس تبدیلی کو مثبت اور مفید انداز میں استعمال کرتے ہیں اور ان تبدیلیوں کے سامنے سپرانداز نہیں ہوتے۔ آپ نے آندھیاں آتے ہوئے دیکھی ہوں گی۔ وہ درخت جو آندھیوں کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں لیکن جو ان آندھیوں کو راستہ دیتے ہیں، سلامت رہتے ہیں۔ سیلاب تباہ کاریوں کا باعث ہوتا ہے لیکن اسی سیلاب کو استعمال کر کے انسان نے بے شمار مفید کام کئے ہیں یہی حالت تغیّر کی ہے۔ اگر ہم تغیّر کا دھارا روکنے کی کوشش کریں گے تو وہ ہمیں سیلاب کی طرح بہا کر لیے جائے گا لیکن اگر ہم اس کے پہلے سے تیار ہوئے تو ہم اس تغیّر کے دھارے کو روکنے کی بجائے اس کا رخ اپنی ضروریات کے مطابق موڑ سکیں گے اسی لیے تمام عقلمند

لوگ جمود کو پسند نہیں کرتے بلکہ تغیرات کو فطری امر گردان کر اس سے مفاہمت کرتے ہیں اور وہ تغیرات ان کو نقصان کے بجائے فائدہ پہنچاتے ہیں۔ فارسی کے ایک شاعر نے حضرت علی علیہ السّلام کے اس قول کو نہایت خوبصورتی سے رباعی میں ڈھالا ہے۔

روزی رود این جوانی از دست بڑن   دین مسن کہ توانا است شود پیر و زبوں

تو کی مانی بحال خود چمن گردوں   کو شد کہ بہ تندی کندت دیگر گوں؟

یعنی ایک دن یہ جوانی ہاتھ سے نکل جائے گی اور یہ جسم کہ آج توانا ہے، بوڑھا اور کمزور ہو جائے گا۔ تم اپنی ایک سی حالت پر کیونکر برقرار رہ سکتے ہو جب کہ زمانہ بڑی تیزی سے تمہیں دگرگوں کرنے پر تُلا ہُوا ہے۔

لہٰذا وہ لوگ جو تغیر کے لیے تیار رہتے ہیں اور اسے فطری امر قرار دے کر اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتے ہیں، خوش و خرم رہتے ہیں لیکن اس کے برعکس جمود کے دلدادہ لوگ تبدیل تو ہو جاتے ہیں لیکن وہ اس تبدیل شدہ حالت کو قبول نہیں کرتے اور گذری ہوئی حالت کی یاد میں اپنے آپ کو گم کر دیتے ہیں جو حالت افراد کی ہے وہی اقوام کی ہے۔ عقل مند قومیں اپنے آپ کو آنے والے تغیرات کے لیے تیار کرتی ہیں اور یوں ان تغیرات کی تباہ کاریوں سے بچ نکلتی ہیں۔ اسلام بھی ایک حرکی دین ہے وہ اپنے ماننے والوں کو ہمیشہ آئندہ کے لیے تیار رہنے کو کہتا ہے یہی اس کی آفاقیت کا راز ہے۔

عقل کا استعمال

معاشرے کے امراض میں سے ایک مرض جو اس کے تار و پود کو بری طرح بکھیر دیتا ہے غلط خبروں اور بے معنی بیانوں پر یقین کر لینا اور انہیں دوسروں تک پہنچانا ہے۔ اسے دوسرے الفاظ میں افواہیں پھیلانا کہتے ہیں۔ معاشرے کے دشمن افراد سادہ لوح افراد کو غلط خبریں دیتے ہیں اور وہ اپنی سادہ لوحی کی بنا پر ان کو درست تسلیم کر کے دوسروں تک پہنچاتے ہیں اور یوں پورا معاشرہ آہستہ آہستہ اس غلط خبروں کے چنگل میں گرفتار ہو کر بے بس ہو جاتا ہے۔ اس بے بسی سے دشمن فائدہ اٹھاتا ہے۔

جناب امیر علیہ السلام نے اپنے خطبات اور مکتوبات میں جہاں ہمیں دین کی معرفت کے درس دیتے ہیں اور اسلام کی حقیقت سے آشنا کرایا ہے وہاں مختلف معاشرتی خرابیوں کی نشاندہی بھی کی ہے اور ان کا علاج بتایا ہے۔ افواہوں کے بارے میں بھی جناب امیر علیہ السلام نے ان کی اساس کی نشاندہی اور ان کے توڑ کا علاج ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

إِعْقِلُوْا الْخَبَرَ إِذَا سَمِعْتُمُوْهُ عَقْلَ رِعَايَةٍ لَا عَقْلَ رِوَايَةٍ فَإِنَّ رُوَاةَ الْعِلْمِ كَثِيْرٌ وَرُعَاتُهُ قَلِيْلٌ۔

یعنی جب کوئی خبر سنو تو اس پر عقل سے غور کرو۔ اور یہ عقل جانچ پڑتال کرنے والی عقل ہونا چاہیئے۔ نہ وہ عقل جو صرف بیان کرتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ علم بیان کرنے والے تو بہت سے ہیں لیکن اس کی جانچ پڑتال کرنے والے بیحد کم۔

جناب امیر علیہ السلام نے ایک واضح اصول بیان فرمایا ہے کہ جب کوئی بات سنو تو فوراً اس پر یقین نہ کر لیا کرو۔ عام طور پر ہم کسی کی شخصیت یا اس کے مرتبہ یا حیثیت سے مرعوب ہو کر اس کی بیان کردہ خبر کو بعینہٖ تسلیم کر لیتے ہیں اور ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہیں سوچتے کہ وہ خبر غلط بھی ہو سکتی ہے یا بیان کرنے والا اشتباہ کا شکار ہو سکتا ہے اس کے دو بڑے نتیجے برآمد ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ غلط خبر سے کر لوگوں کو دھوکہ دینے والا اپنے اس یقین میں پختہ ہو جاتا

ہے کہ لوگ اس کی ہر بات کا یقین کر لیں گے اور وہ یوں اپنی شخصیت کے اثر کا غلط فائدہ اٹھاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس طرح غلط خبریں رائج ہو کر معاشرے میں مزید خرابیوں کا باعث ہوتی ہیں۔ تاریخ میں افواہوں کی بنا پر برپا ہونے والے فتنوں کی داستاں بڑی طویل ہے۔ محمد شاہ کے عہد میں نادر شاہ کے ہاتھوں ہونے والے قتلِ عام کا باعث ایک افواہ ہی تھی۔

غلط خبروں پر بغیر چھان بین کے یقین کر لینے کے نقصانات اس وقت اور بھی خطرناک ہو جاتے ہیں۔ جب کوئی شخص بدنیتی یا بے وقوفی یا غیر ذمہ دارانہ رویے کی بنا پر کسی قابلِ احترام ہستی کے بارے میں کوئی غلط بات بیان کرے یا کوئی بے بنیاد و بیان اس سے منسوب کرے۔ مسلمانوں میں احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں جو تحقیقات اور علوم رونما ہوئے ہیں ان کی اساس بھی یہی ہے کہ کوئی شخص غلط حدیث وضع نہ کر سکے اور اسے رائج نہ کر سکے۔ آئمہ حدیث نے احادیث کے بارے میں جو جانکاہ کوششیں کی ہیں وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے باوجود کہ "جس شخص نے میرے بارے میں کوئی غلط بات بیان کی اس نے جہنم میں اپنی جگہ حاصل کر لی" بے شمار وضعی حدیثیں رائج ہو گئیں اور ان کی پہچان کے لیے علوم حدیث کی تدوین عمل میں آئی۔ یہ سب کچھ اسی بنا پر ہوا کہ عام لوگوں میں کسی کی شخصیت کے زیرِ اثر اس کی بیان کردہ بات کی چھان پھٹک کا رویہ موجود نہیں ہوتا۔ اسی لیے قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ۔

یعنی اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو نادانی کی وجہ سے نقصان پہنچا دو اور اپنے کیے پر تمہیں ندامت ہو۔ اسی طرح حدیث شریف میں بھی وارد ہوا ہے کہ یہ مت دیکھو کہ کہنے والا کون ہے۔ بلکہ یہ دیکھو کہ اس نے کہا کیا ہے کیونکہ اس طرح سے بات کو تولنے کی عادت پڑتی ہے۔

علاوہ ازیں ہمارے معاشرہ میں بے شمار خیالات، اعتقادات اور عادات صرف اس لیے رائج ہو گئے ہیں کہ ہم نے آنکھیں بند کر کے کہنے والے کی شخصیت سے مرعوب ہو کر انہیں اختیار کر لیا اور یہ نہ سوچا کہ وہ بات درست بھی ہے یا نہیں حالانکہ اسلام وہ واحد دین ہے جس نے لوگوں کو غور و فکر کرنے کی عادت اختیار کرنے پر زور دیا ہے۔ اگر ہم اسلامی تعلیمات پر عمل کریں اور اپنے بزرگوں کی راہ پر چلیں تو نہ صرف ہمیں انفرادی فوائد حاصل ہوں بلکہ اجتماعی سطح پر بھی۔ ہمارے لیے عقلی اور سائنسی نقطۂ نظر کو اپنانے اور یوں ترقی کرنے کے مواقع پیدا ہو جائیں۔

بے جا خاموشی

باب مدینۃ العلم جناب امیر علیہ السلام کے اقوال میں جو حکمت و فراست کے موتی ملتے ہیں ان کا حصار کرنا ممکن نہیں کہ انہوں نے اپنی زبان مبارک کو تبلیغ پیغام حق اور تشریح اقوال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اسی طرح استعمال فرمایا جس طرح دین حق کے دفاع کے لیے بدر و احد و خندق و خیبر و حنین میں اپنے زور بازو اور اپنی تلوار کو خود ان کے اپنے قول کے مطابق جہاد زبان کے ذریعے سے بھی ہو سکتا ہے۔ اور انہوں نے اپنی زندگی میں زبان اور تلوار دونوں کو جہاد فی سبیل اللہ میں استعمال فرمایا۔ آج ہم اسی لسانی جہاد کا ایک نمونہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ جناب امیر علیہ السلام کا ارشاد ہے:

اَلرَّاضِیْ بِفِعْلِ قَوْمٍ کَالدَّاخِلِ فِیْہِ مَعَھُمْ وَعَلٰی کُلِّ دَاخِلٍ فِیْ بَاطِلٍ اِثْمَانِ اِثْمُ الْعَمَلِ بِہٖ وَاِثْمُ الرِّضٰی بِہٖ۔ یعنی کسی گروہ کے کسی کام پر اظہار رضامندی ایسا ہی ہے جیسے اس کام میں شرکت۔ اور یوں باطل میں داخل ہونے والا اپنے اوپر دو گناہ لیتا ہے ایک گناہ تو کام کرنے کا اور دوسرا گناہ اس پر اظہار رضامندی کا۔

اس قول کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کسی گروہ کو برا کام کرتے دیکھ کر خاموش ہو جانا ایک طرح کی اظہار رضامندی ہے گویا خود اس میں شریک ہوتا ہے اور اس کے علاوہ مزید گناہ یہ ہے کہ انسان برے کام پر رضامندی کا اظہار کرے۔ دوسرے لفظوں میں برائی کو دیکھ کر خاموش رہنے والا برا کام کرنے والے کے مقابلہ میں دوگنا گناہگار ہے۔ سید امیرؑ کا یہ قول امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تفسیر ہے۔ اسلام کا یہ زرین اصول معاشرتی اصلاح کی بنیاد ہے۔ کیونکہ اگر برائی کا ارتکاب ہوتے ہوئے دیکھ کر افراد معاشرہ خاموش رہیں تو برائی کو جڑ پکڑنے کا موقع مل جاتا ہے اور دوسروں کو بھی اس برائی کے ارتکاب کا حوصلہ ملتا ہے لیکن اگر افراد معاشرہ برائی کے ارتکاب کی مذمت کرنا شروع کر

دیں تو بُرائی کا فوری طور پر سدِ باب ہو جاتے اور یوں معاشرتی اصلاح کا عمل جاری رہتا ہے۔ یہ بات عین فطرت کے مطابق اور اجتماعی ضروریات کا تقاضا ہے اسی بنا پر معاشرہ میں افراد پر یہ پابندی لگائی جاتی ہے کہ وہ جرم کے ارتکاب کو دیکھ کر خاموش نہ رہیں بلکہ فوری طور پر متعلقہ حکام کو اس کی اطلاع دیں۔ بعض قوانین میں تو یہ بات بذاتِ خود ایک جرم ہے۔ تعزیراتِ پاکستان کے مطابق بھی شہریوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ مجرموں کی سرگرمیوں کی اطلاع پولیس کو دیں ورنہ ان کے خلاف کارروائی ہو سکتی ہے۔ اجتماعی نظام جزا و سزا میں جہاں اچھے کو اچھا کہنا لازم ہے وہاں بُرے کی مذمت کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ بُرے کو بُرا نہ کہا جائے اور اسے سزا نہ دی جائے تو اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے ہمارے معاشرے میں بہت سی بُرائیاں اس لیے پھیلتی ہیں کہ ہم بُرے فعل پر خاموش رہتے ہیں اور اس کی مذمت نہیں کرتے اور یوں اسے مضبوط ہونے کا موقع دیتے ہیں۔

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو بار بار اس امر کی تلقین کی ہے کہ برائیوں سے روکو۔ حضرت علی علیہ السلام نے ایک اور مقام پر برائیوں کے روکنے کا طریقہ بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جہاد تلوار سے ہوتا ہے اور زبان سے ہوتا ہے اور پھر دل سے ہوتا ہے اور پھر فرمایا کہ ـــــ مَنْ لَمْ يَعْرِفْ بِقَلْبِهِ مَعْرُوفًا وَلَمْ يُنْكِرْ مُنْكَرًا قُلِبَ فَجُعِلَ أَعْلَاهُ أَسْفَلَهُ وَأَسْفَلُهُ أَعْلَاهُ

یعنی جس شخص نے دل سے اچھائی کو نہ پہچانا اور برائی کی مذمت نہ کی اس نے تمام کام الٹ کر دیے

قرآن مجید اور احادیثِ شریفہ میں امر بالمعروف کے ساتھ فوراً نہی عن المنکر کا ذکر ملتا ہے۔ خود حدیث مبارک میں یہ حکم موجود ہے کہ اگر برائی کو ہاتھ سے نہ روک سکو تو زبان سے روکو اور اگر زبان سے بھی نہ روک سکو تو پھر دل سے یعنی اس کی مذمت کرو۔ معاشرتی توازن کو برقرار رکھنے کے لیے اس اصول پر عمل کرنا بے حد ضروری ہے۔ جب ہم بُرے کی برائی کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ ہمیں کیا غرض، تو گویا اس کی بُرائی میں شریک ہو جاتے ہیں اور حضرت علیؑ کے قول کے مطابق دوہرا گناہ کرتے ہیں اس کا نتیجہ ہمیں آج بھی مل رہا ہے اور روزِ قیامت بھی اس کی سزا سے ہم بچ نہیں سکتے۔

پُرخوری

حضرت علی علیہ السلام کی صفات میں ایک صفت زہد کی ہے۔ ان کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک دن کی بیٹی نے ان کے سامنے کھانے میں جَو کی روٹی، سرکہ اور دودھ رکھا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ دودھ اٹھالیا جائے کیونکہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی زندگی میں دو سالن نہیں کھائے، اس واقعہ سے نہ صرف اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ حضرت علیؑ کس قدر سنت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پابند تھے بلکہ اس کا سراغ بھی ملتا ہے کہ وہ کھانے میں پُرخوری کے خلاف تھے۔ کھانا انسان کی ضرورت ہے لیکن اسے ضرورت ہی رہنا چاہیئے اگر وہ مقصد بن جائے تو پھر خرابی پیدا ہوتی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے کھانے سے انکار نہیں کیا بلکہ زیادہ کھانے سے انکار کیا ہے۔ ان کا زہد غیر مسلم تارک الدنیا راہبوں کا زہد نہیں کہ انسان کی جائز اور فطری ضروریات کی نفی ہو بلکہ زہد کے بارے میں ان کا قول ہے کہ: لَیْسَ الزُّھْدُ اَنْ لَا تَمْلِکَ الشَّیْئَ وَلٰکِنَّ الزُّھْدَ اَنْ لَا یَمْلِکُکَ الشَّیْئُ: یعنی زہد یہ نہیں کہ تم کسی چیز کے مالک ہی نہ ہو بلکہ زہد کے معنی یہ ہیں کہ چیزیں تمہاری مالک نہ بن جائیں۔

حضرت علی علیہ السلام کے اقوال میں زیادہ کھانے کے بارے میں بہت سے اقوال ملتے ہیں جن میں لوگوں کو پُرخوری سے منع کیا گیا۔ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ لَا تَجْعَلُوْا بُطُوْنَکُمْ مَقَابِرَ الْاَنْعَامِ یعنی اپنے پیٹوں کو جانوروں کا مقبرہ نہ بناؤ یعنی زیادہ گوشت کھانے سے پرہیز کرو۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ایک خط میں یہ شعر لکھتے ہیں: ؎

فَحَسْبُکَ دَاءً اَنْ تَبِیْتَ بِبِطْنَةٍ

وَحَوْلَکَ اَکْبَادٌ تَحِنُّ اِلَی الْقِدِّ

یعنی تمہارے لیے یہ مرض ہی کافی ہے کہ تم تو پیٹ بھر کر رات گذارو اور تمہارے گرد و پیش میں ایسے لوگ ہوں جو چھچھڑوں کے لیے ترس رہے ہوں۔

اس سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام کا یہ قول غور و فکر کا طالب ہے۔

اِیَّاكَ وَالْبِطْنَةَ فَمَنْ لَزِمَهَا كَثُرَتْ اَسْقَامُهٗ وَفَسَدَتْ اَحْلَامُهٗ

یعنی پرخوری سے گریز کرو کیونکہ جو شخص پرخوری اختیار کرے اس کی بیماریاں بڑھ جاتی ہیں اور نیندیں خراب ہو جاتی ہیں۔ جناب امیر علیہ السلام کے اس قول کو فارسی شاعر نے نہایت خوب صورتی سے اس رباعی میں منعکس کیا ہے۔

آنکس کہ شکم خوار چو حیوان گردد — پرخواری او رنج تن و جان گردد
بیماری و درد او فراواں گردد — خواب شب او بتر پریشان گردد

یعنی ہر وہ شخص جو حیوانوں کی مانند پیٹ بھر لیتا ہے اس کی پرخواری اس کے لیے جسم اور روح کے رنج کا باعث بنتی ہے اس کی بیماریاں بڑھ جاتی ہیں اور اس کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔

ہمارے زمانے میں جو امراض زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ان میں بیشتر زیادہ کھانے اور غلط طریقے سے کھانے کی بنا پر ظاہر ہوتے ہیں۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک بازنطینی حکیم مدینے میں آیا۔ خاصے دن وہاں رہنے کے بعد اس نے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم سے مریضوں کے ناپید ہونے کا شکوہ کیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ ہم وہ لوگ ہیں کہ جب تک ہمیں بھوک نہ لگے ہم کھانا نہیں کھاتے اور کبھی پیٹ بھر کر نہیں کھاتے اس لیے ہمارے ہاں بیمار کم ہیں۔ ظاہر ہے جو شخص پرخور نہیں ہوگا وہ امراضِ معدہ کا شکار نہیں ہوگا اور ان سے پیدا ہونے والی بیماریوں میں مبتلا نہیں ہوگا۔

درست ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے اس قول میں بظاہر پیٹ بھرنے کے نقائص بیان کئے ہیں۔ لیکن اگر یہاں الفاظ کو وسیع تر مفہوم میں لیا اور بطنہ کے معنی مجازی سے مختلف اشیاء کے حصول میں افراط مراد لی جائے تو یہ قول پوری معاشرتی زندگی کے جملہ نقائص کی نشاندہی کرتا ہے۔ پہلے تو یہ بات غور طلب ہے کہ جو شخص زیادہ کھاتا ہے وہ لازماً

کسی کا حصہ غصب کرتا ہے خصوصاً ایسے معاشرے میں جہاں کھانے پینے کی اشیاء کی قلت ہو وہاں کسی فرد واحد کا حد سے زیادہ کھانا دوسروں پر ضرور اثر انداز ہوگا۔ مہنگائی کا ایک سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اشیاء کم ہو جاتی ہیں۔ اور اشیاء کی کمی کا سبب ان کا زیادہ استعمال ہے۔ ہمارے ہاں شادی بیاہ کے موقعوں پر کھانا استعمال ہونے سے کہیں زیادہ ضائع ہوتا ہے۔ اگر اس سلسلہ میں افراط کی بجائے احتیاط اور درست استعمال پر عمل کیا جائے تو اشیاء حاجت مندوں کی حاجتیں پوری ہو سکتی ہیں۔

کھانے کے علاوہ دیگر ضروریاتِ زندگی کا حد سے زیادہ حصول بھی حد سے زیادہ کھانے کے مشابہ ہے جمع کر لینے کی ہوس چیزوں کی قیمتوں میں اضافہ کرتی ہے جن لوگوں کے پاس مہنگی اشیاء خریدنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ وہ محرومی کا شکار ہوتے ہیں اور یوں معاشرے میں اضطراب بڑھتا ہے اور معاشرتی امراض جنم لیتے ہیں۔ دنیا کے امیر ملکوں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، دولت کی فراوانی اور ضروریاتِ زندگی کی بہتات کے باوجود وہاں بے چینی کا راج ہے۔ یہ سب فساد اسی بنا پر پیدا ہوتے ہیں کہ انسان ہوس کی بنا پر ضرورت سے زیادہ چیزیں حاصل کر کے خود بھی پریشان ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی پریشان کرتا ہے۔ اسی بات کو حضرت علی علیہ السلام فرت اعلام کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ہوسِ زر

انسان جن اشیاء سے اساسی طور پر محبت کرتا ہے اور ان کے حصول کے لیے مر مٹتا ہے ان میں مال بھی شامل ہے۔ انسانی زندگی کے بہت الیے اسی مال کی بنا پر وجود میں آتے ہیں بعض ادیان نے اپنے ماننے والوں کو اس بات کی تلقین کی ہے کہ وہ ترک دنیا کا راستہ اختیار کریں اور مال و دولت سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ لیکن بدقسمتی سے یہ بات فطرت کے خلاف ہے کیونکہ مال کے بغیر زندہ رہنے کے لیے سامان فراہم کرنا ممکن نہیں اس لیے قرآن مجید نے مال کو ہمارے لیے آزمائش قرار دیا۔ دوسرے الفاظ میں مال کے ذریعے سے ہمیں جانچا جاتا ہے۔ کہ مال دنیا کے غلام ہیں یا کچھ اور ہیں۔ اسلام مال سے علیحدگی کی تلقین نہیں کرتا۔ اور دیگر ادیانِ عالم کے مانند ہمیں ترک دنیا پر نہیں اکساتا۔

جناب امیر علیہ السلام کہ تعلیماتِ اسلامیہ کی چلتی پھرتی تصویر اور سنّت نبویؐ کا جیتا جاگتا مرقع تھے، اپنے خطبات میں متعدد مقامات پر مال کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں اور ہمیں اس سلسلہ میں راہ ہدایت کی نشاندہی فرماتے ہیں۔ ان کے نزدیک زہد یہ نہیں کہ انسان کے پاس کچھ ہے ہی نہیں بلکہ زہد کے صفحے یہ بھی کہ انسان اشیاء کا غلام نہ ہو جائے

لَیْسَ الزُّھْدُ أَنْ لَا تَمْلِكَ الشَّیْءَ وَلٰکِنَّ الزُّھْدَ أَنْ لَّا یَمْلِكَكَ الشَّیْءُ۔

بعض لوگ جب مال میں راہِ اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ یہ مال حلال کے راستہ سے آرہا ہے یا حرام کے۔ انھیں ہوسِ زر اندھا کر دیتی ہے اور وہ مال کے جمع کرنے میں احکامِ الٰہیہ کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ جہاں امیر علیہ السلام ایسے لوگوں کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔ اِنَّ اَعظم الحسرات یوم القیامة حسرة رجلٍ کسب مالًا فی غیر طاعة الله فورثه رجل فانفقه فی طاعة الله فدخل به الجنة ودخل الاولُ به النار

یعنی قیامت کے دن عظیم ترین حسرت اس شخص کی ہوگی جس نے اطاعتِ خُدا

سے منہ موڑ کر مال کمایا اور اس مال کا ایک ایسا شخص وارث ہوا جس نے اس مال کو اللہ کی اطاعت میں خرچ کیا اور یوں اس کے ذریعے سے جنت میں داخل ہوا جب کہ پہلا شخص جس نے خدا کی نافرمانی کر کے وہ مال کمایا تھا' وہ اسی مال کے ذریعے سے جہنم میں داخل ہوا۔

جناب امیر علیہ السلام نے اپنے اس قول میں ان لوگوں سے خطاب کیا جو ہوسِ زر میں احکامِ خدا کی خلاف ورزی کرتے ہیں انہیں ایک ہی بات کا سودا ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال کمائیں چاہے اس کا وسیلہ حرام ہی کیوں نہ ہو۔ رشوت لے کر، رشوت دے کر، ذخیرہ اندوزی، اقربا پروری، سمگلنگ، دھوکہ بازی، اشیاء میں ملاوٹ، گندم نمائی۔ اور جو فروشی کر کے، لوگوں کے حقوق غصب کر کے، سود حاصل کر کے، کم تول کر اور اسی قسم کے دوسرے ذرائع کسبِ مال اسلام میں حرام ہیں۔ حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم ہے۔ کہ: مَنْ غش فلیس منّا۔ یعنی جس نے اشیاء میں ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں اسیطرح نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احتکار (یعنی ذخیرہ اندوزی کرنے والوں پر لعنت ڈالی ہے لیکن بہت سے اشخاص صرف کسب مال سے غرض رکھتے ہیں یہ نہیں دیکھتے کہ اس کا ذریعہ حلال ہے یا حرام۔ بس مال کمانے چلے جاتے ہیں اور لطیفہ یہ ہے ہوسِ زر ان میں بخل بھی پیدا کر دیتی ہے اور وہ اس مال سے فائدہ تک بھی نہیں اٹھا سکتے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وقتِ مرگ وہ مال ان کا ساتھ چھوڑ جاتا ہے اور ان کے ورثے اس پر متصرف ہو جاتے ہیں۔ اب اگر یہ ورثہ اس مال کو احکام الٰہیہ کے مطابق خرچ کریں تو وہ اپنے لیے زادِ راہ آخرت فراہم کرتے ہیں اور جنت کے مستحق بنتے ہیں۔ مال وہی ہے لیکن کمانے والے کی بدنصیبی کہ اس کا کیا دھرا اکارت جاتا ہے اور وہی ان کو جہنم کی راہ دکھاتا ہے لیکن اس کے وارث بغیر محنت اسی مال کو حاصل کر کے اور راہِ خدا میں خرچ کر کے جنت میں جانے کا سبب حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں حرام کا مال کمانے والے کی حسرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جسے اس کی کمائی تو عذاب میں مبتلا کرے اور غیروں کو انعامِ الٰہی کا حقدار بنائے۔

قرآن مجید میں بھی ایسے لوگوں کی مذمت کی گئی۔ سورۂ مطففین میں ناپ تول میں کمی کرنے

والوں کی برائی کی گئی ہے۔ اسی طرح سورۂ ماعون اور سورہ الھمزہ میں بھی اسی قماش کے لوگوں کو عذاب کی خبر دی گئی ہے۔ حرام کی کمائی نہ صرف کمانے والے کے لیے عذاب کا باعث ہوتی ہے بلکہ اس سے تمام معاشرہ اثر پذیر ہوتا ہے۔ تصوّر فرمائیے۔ اگر ہمارے معاشرے سے کمائی کے حرام ذرائع کا خاتمہ ہو جائے تو ہماری کیا کیفیت ہو اور کتنی برائیوں اور خرابیوں سے ہمیں نجات مل جائے۔

طمع

حضرت علی علیہ السلام کا ایک قول ہے جس کا تعلق ایک انفرادی اور اجتماعی نفسیاتی مرض سے ہے جسے ہر دور میں اور ہر مکتب فکر نے قابل مذمت گردانا ہے اس مرض کا نام ہے طمع۔ اس مرض میں مبتلا افراد اور معاشرے کی خرابیوں کے سرطان میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یعنی خواہشات بے راہ روی کے ساتھ بڑھنا شروع کر دیتی ہیں اور انسان ان کے جال میں گرفتار ہو جاتا ہے خواہشات کا پیدا ہونا فطری امر ہے اور ان کا باعث ہماری ضروریات ہوتی ہیں۔ جب ضرورت کو پورا کرنے کے لیے خواہش پیدا ہو تو وہ مرض نہیں لیکن جب بے ضرورت خواہشات پیدا ہونا شروع ہو جائیں یا ایسی اشیاء کے حصول کی خواہشیں ابھرنا شروع ہوں جن کی ضرورت ہی نہیں تو پھر اس مرض کا آغاز ہوتا ہے اور طمع کے جال میں پھنسا ہوا انسان کسی اور کام کا نہیں رہتا۔ اس کی ساری تگ و دو اشیاء کے حصول تک محدود ہو جاتی ہے نہ وہ ان کو خود استعمال کرتا ہے نہ دوسروں کو کرنے دیتا ہے اور اکثر اوقات اسے اسکی خبر بھی نہیں ہوتی کہ اس نے کوئی خاص شے حاصل کس لیے کی۔ پس ہر شے کو حاصل کرنا اس کا شعار بن جاتا ہے۔ جناب امیر علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ اَلطَّمَعُ رِقٌّ مُؤَبَّدٌ یعنی طمع ابدی غلامی ہے یعنی طمع پرور انسان اپنی خواہشات کا غلام بن جاتا ہے اور اس غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب طمع انسان کے دل میں جڑ پکڑ لے تو پھر اس کے بس میں نہیں رہتا۔ ایک خواہش پوری ہو کر دوسری خواہش کو جنم دیتی ہے اور یوں یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ نفسیات کی اصطلاح میں on zoaa کو یعنی ہوا و ہوس کہا جاتا ہے اور aaai on کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ انسان ایک ہی چیز کا ہو کر رہ جاتا ہے گویا اس کا اسیر ہو جاتا ہے۔ طمع کے شکنجے میں جکڑا ہوا انسان اپنی زندگی صرف اس بات کے لیے حرام کر دیتا ہے کہ جو چیز اسے دکھائی دے اسے حاصل کرنا چاہیے اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو صرف یہی نہیں بلکہ طماع شخص ایک ایسے مقام پر بھی پہنچ جاتا ہے جب اسے کسی شے کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ شے اس کے پاس موجود ہوتی

ہے۔ لیکن وہ اس خوف سے اسے استعمال نہیں کرتا کہ کہیں اس میں کمی واقع نہ ہو جائے اور یوں وہ اپنی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا۔ محرومی اس کا مقدر بن جاتی ہے اور اس میں ایک مرض پیدا ہو جاتا ہے جسے بخل کہتے ہیں۔ صرف یہی نہیں طمع انسان کو ہر اخلاقی قید کے خلاف کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہے اور وہ شدید سے شدید جرم بھی کرنے سے نہیں چوکتا۔ جدید دور کے اجتماعی امراض مثلاً ذخیرہ اندوزی، منافع خوری اور بلیک مارکیٹنگ کا تجزیہ کیجیے تو آپ اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ یہ تمام اجتماعی امراض اور معاشرتی جرائم طمع ہی کا نتیجہ ہیں۔ اس طمع کی بنا پر انسان رشوت دیتا ہے اور رشوت لیتا ہے اور جرائم کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر اسلام میں خواہشات کو یوں بے لگام چھوڑ دینے کی مذمت کی گئی ہے اور قرآن مجید میں بار بار ان لوگوں کو مذموم قرار دیا گیا ہے جو ہوس کے غلام بن جاتے ہیں اور دن رات روپیہ پیسہ جمع کرنے کے جرم میں گرفتار رہتے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام طمع سے نفرت دلانے کے لیے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ "الرق" ہے جس سے بدترین قسم کی غلامی مراد ہے بلاغت علویہ عربوں کو طمع سے گریز کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے اس لفظ کو استعمال کرتی ہے جس کے مفہوم سے عربوں کو شدید نفرت ہے کہ وہ آزادی کے دلدادہ تھے اور غلامی ایک عیب تھی اور صرف عرب ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر قوم غلامی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اس لفظ کو استعمال کر کے جناب امیرؑ نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے تین لفظوں پہ مشتمل یہ قول معاشرتی برائیوں کی اصل اساس کا سراغ دیتا ہے اور کمال ایمانیت کے ساتھ سننے والوں کے ذہن میں اس برائی کے خلاف جذبہ نفرت پیدا کرتا ہے یہ فصاحت و بلاغت پر تقویٰ کی ایک معمولی سی مثال ہے اور یہ فصاحت و بلاغت جہاں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیض تربیت کا فیض ہے جسے جناب امیرؑ نے اس پیغام کو پھیلانے کے لیے استعمال فرمایا جو ذاتِ نبی کریمؐ میں مجسّم تھا تاکہ متمم مکارم اخلاق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماننے والوں کو تزکیہ نفس کی منزل طے کرنے میں مدد ملے اور وہ اسوۂ رسولِ حقؐ کے آئینہ دار بن سکیں۔

ظلم

حضرت امیر علیہ السلام کے کلام بلاغت نظام میں اہلِ فکر و نظر کے لیے رنگ رنگ کے افکار سجے ہیں۔ ان کے یہ خطبات، مکاتیب اور اقوال جو نہج البلاغہ میں محفوظ ہیں۔ انسانی فکر کی ہر سطح اور سوچ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں ان میں ایک معرکے کی تحریر ہے جو تعلقات اور انتظامیات اور تدبیر مملکت پر ایک مکمل اور جامع اسلامی دستور العمل ہے جس میں ان امور کی تاریخ انسانیت میں پہلی بار انسانی نقطہ نظر زیر بحث لایا گیا ہے یہ وہ تحریر ہے جو امام علیہ السلام جناب مالک ابن اشتر رحمۃ اللہ کو اس وقت عطا فرمائی جب وہ مصر گورنر کا عہدہ سنبھالنے کے لیے جناب امیر علیہ السلام سے رخصت ہو رہے تھے۔ اس تحریر میں جناب امیرؑ فرماتے ہیں۔

وَمَنْ ظَلَمَ عِبَادَ اللّٰهِ كَانَ اللّٰهُ خَصْمَهُ دُوْنَ عِبَادِهٖ وَمَنْ خَاصَمَهُ اللّٰهُ اَدْحَضَ حُجَّتَهُ وَكَانَ اللّٰهُ حَرْبًا حَتّٰى يَنْزِعَ وَيَتُوْبَ وَلَيْسَ شَيْءٌ اَدْعٰى اِلٰى تَغْيِيْرِ نِعْمَةِ اللّٰهِ وَتَعْجِيْلِ نِقْمَتِهٖ مِنْ اِقَامَةٍ عَلٰى ظُلْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ دَعْوَةَ الْمُضْطَهَدِيْنَ وَهُوَ لِلظَّالِمِيْنَ بِالْمِرْصَادِ۔

یعنی جو کوئی خدا کے بندوں پر ظلم کرتا ہے تو خدا خود اپنے بندوں کی طرف سے اس کے خلاف صف آرا ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے جس کے خلاف خدا اُٹھ کھڑا ہو اس کے تمام حیلے ختم ہو جاتے ہیں۔ تمام حجتیں باطل ہو جاتی ہیں اور وہ شخص خدا کے خلاف جنگ آزمائی کا مجرم بن جاتا ہے۔ تاوقتیکہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائے اور توبہ کر لے۔ خدا کی نعمت کو اس سے بڑھ کر بدلنے والی اور عذاب خدا کو اس سے زیادہ دعوت دینے والی چیز اور کوئی نہیں کہ آدمی ظلم اختیار کرے۔ یاد رہے کہ خدا مظلوموں اور سختی کے ماروں کی سنتا ہے اور ظالموں کی تاک میں رہتا ہے۔

ظلم اور انصاف کا موضوع انسانی تاریخ کا بے حد قدیم موضوع ہے اور ہر شخص چاہے دل سے چاہے لوگوں کی تقلید میں ظلم کی مذمت کرتا ہے لیکن اجتماعی ستم ظریفیوں میں ایک ستم کی ستم ظریفی

یہ ہے کہ ہر دور میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں جو ظلم و ستم کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ ظلم و ستم روا بھی رکھتے ہیں اور اسے انصاف کہتے ہیں۔ عام طور پر ظلم سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ کسی شخص کو مارا پیٹا جائے اس کی ملکیت کی چیزیں اس سے چھین لی جائیں۔ اسے اس کے حقوق سے محروم کر دیا جائے۔ درست ہے کہ یہ سب باتیں ظلم کی تعریف میں شامل ہیں لیکن ان کے علاوہ اور بھی باتیں ہیں جو ظلم کی حدود میں شامل ہیں لیکن ہم کبھی ان کے بارے میں یہ گمان بھی نہیں کرتے کہ وہ ظلم ہیں۔ اصل میں عربی میں ظلم کی تعریف ذرا مختلف ہے۔ اس کے مطابق اَلظُّلْمُ هُوَ وَضْعُ الشَّيْئِ بِغَيْرِ مَحَلِّهِ۔ یعنی کسی چیز کو اس کے اپنے مقام سے ہٹانا اور غلط جگہ رکھنا ظلم ہے۔ قرآن مجید میں، احادیث میں، کلام امیر المومنینؑ میں، اور عام اسلامی کتابوں میں جہاں کہیں ظلم کا ذکر ہوا ہے اسی مفہوم میں ہوا ہے اس بات کو پیش نظر رکھیں تو ہمارے بیشمار فردی اور اجتماعی اعمال ظلم کہلائے جا سکتے ہیں۔ قرض کو ادا نہ کرنے سے لے کر منافع خوری، ذخیرہ اندوزی، استحصال اور قتل سبھی کچھ ظلم ہے۔ لیکن ہم قتل کو تو ظلم گردانتے ہیں لیکن جب ہم کسی ضرورت مند کے پاس دو روپے کی چیز دس روپے میں بیچتے ہیں تو ہم اسے ظلم نہیں گردانتے حالانکہ یہ بھی ظلم ہے اور اس کی سزا بھی خداوند عالم سے مل کر رہتی ہے چاہے اس دنیا میں اور چاہے روز قیامت۔ کم از کم اسلام ہمیں یہی تعلیم دیتا ہے۔ فردی ظلم تو خراب ہی ہے اجتماعی ظلم اس سے بڑھ کر ہے اور بقول امیر المومنینؑ غضب خدا کو اس سے بڑھ کر قریب کرنے والی اور کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ جب انسانوں کے ایک گروہ پر ظلم ہو تو وہ سب مل کر خدا سے فریاد کرتے ہیں۔ اور خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے ممکن ہے کہ اس میں دیر ہو جائے اور ظالم وقتی طور پر کامیاب ہو جائیں لیکن بالآخر انہیں عذاب الٰہی کا مزہ چکھنا ہی پڑتا ہے اسلامی اخلاقیات کی کتابوں میں ظلم کے خلاف اسی لیے مختلف ابواب رکھے گئے ہیں اور اہل اقتدار کو عدل و انصاف سے کام لینے کی تلقین کی گئی ہے تاکہ بندگان خدا ان کے خلاف خدا سے مدد طلب نہ کریں۔ اسی بنا پر جہاں امیر علیہ السلام نے اپنے عہدہ داروں کو بار بار عدل و انصاف سے کام لینے کی تلقین کی ہے اور معمولی معمولی فرو گذاشتوں پر انہیں سرزنش کی ہے کیونکہ حکومت اور اقتدار کفر و شرک کے باوصف برقرار رہ سکتے ہیں۔

لیکن ظلم کی بنسیاد پر زیادہ دیر نہیں چل سکتے۔

جناب امیر علیہ السلام نے ایک اور مقام پر نہایت واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے کہ اَلْمُلْکُ یَبْقٰی مَعَ الْکُفْرِ وَلَا یَبْقٰی مَعَ الظُّلْمِ ۔ کہ ملک کفر کے ساتھ تو باقی رہ سکتا ہے لیکن ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتا۔

اسلام کے نظام معیشت کی بنیادی قدر رہی عدل ہے اور اگر اس بنیادی قدر کو بھلا دیا جائے تو پھر اسلامی نظام ریت کا محل بن کر رہ جاتا ہے۔

فقر کا سدِّ باب

ابتدائے تاریخ انسانی سے بشری معاشرے بے زر اور با زر لوگوں میں تقسیم ہوتے رہے ہیں اور معاشرے کے ارتقاء کے ساتھ ان دونوں طبقوں کے مابین کشمکش بڑھتی رہی ہے اس کشمکش نے ہمارے زمانہ میں کھلم کھلا تصادم کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اسلام ایک ہی دین ہے جس نے اس صورتِ حال کو نگاہ میں رکھا اور انسانی معاشرے کو امیر اور غریب طبقات کے تصادم سے محفوظ رکھنے کے راستے معیّن کئے۔ اسلام کے مالیاتی نظام کی اساس ہی اس بات پر ہے کہ دولت مند اور غریب لوگوں کے مابین فرق کو کم کیا جائے اور یوں ان طبقات کے مابین کشمکش کو ختم کر کے انسانی معاشرے کو امن و سلامتی سے آشنا کرایا جائے۔

جناب امیر المؤمنینؑ سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقلد اور ان کی تعلیمات کی چلتی پھرتی تصویر ہیں۔ اس اسلامی نقطۂ نظر کو اپنے خطبات و اقوال میں بار بار زیر بحث لاتے ہیں۔ آج کی گفتگو کا موضوع ان کا ایک قول ہے جس میں انہوں نے ان دونوں طبقات کے باہمی تعلق کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے ان کا ارشاد ہے کہ

إِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهُ فَرَضَ فِي أَمْوَالِ الْأَغْنِيَاءِ أَقْوَاتَ الْفُقَرَاءِ فَمَا جَاعَ فَقِيرٌ إِلَّا بِمَا مُتِّعَ بِهِ غَنِيٌّ وَاللّٰهُ تَعَالَى سَائِلُهُمْ عَنْ ذَالِكَ

اس قول کا ترجمہ یوں ہو سکتا ہے کہ بلاشبہ خداوند دو عالم نے دولت مندوں کے مال و دولت میں غریبوں کا رزق بطور فرض رکھا ہے اس لیے کوئی غریب و حاجت مند اس وقت تک بھوکا نہیں رہتا جب تک کوئی غنی اس کے حصے کا رزق خود نہیں کھا جاتا اور خداوند عالم روز اس کے بارے میں سوال کرے گا۔

اس قول میں جناب امیر علیہ السلام اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اگر امراء اپنے فرائض

کو پہچانیں اور انھیں سرانجام دیں تو پھر اسلامی معاشرے میں کوئی شخص حاجت مندی اور بھوک کا شکار نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر امراء حاجت مندوں کی مدد کریں تو پھر ان پر احسان نہیں کریں گے۔ بلکہ اپنا فرض ادا کریں گے اور اگر اس میں کوتاہی کریں گے تو خداوندِ عالم ان سے باز پرس کرے گا۔ اس قول سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اگر کوئی شخص فقر و مسکنت کی حالت میں زندگی گذارے تو معاشرے کے تمام امراء اس کے لیے ذمہ دار ہونگے۔

اس بات کو جناب امیر علیہ السّلام نے ایک اور مقام پر دوسرے انداز میں یوں بیان فرمایا

يَا ابْنَ آدَمَ! مَا كَسَبْتَ فَوْقَ قُوْتِكَ فَأَنْتَ فِيهِ خَازِنٌ لِغَيْرِكَ ـــــ اے اولادِ آدم! جو کچھ تم اپنی ضروریاتِ زندگی سے زیادہ کمایا اس کے سلسلہ میں تو دوسری کی طرف سے خازن اور امین ہے

یعنی مسلمان کی شان یہ ہے کہ جو کچھ اس کے پاس اپنی ضروریات سے زیادہ بچ رہے وہ فی سبیل اللہ ان لوگوں کا مال سمجھے جو حاجت مند ہوں۔ قرآن مجید میں بھی ارشاد باری تعالیٰ ہے

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوُ۔

یعنی وہ تم دریافت کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہ وہ کہ جو کچھ بچ رہے۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اس طرز زندگی کے بے شمار مواقع ملتے ہیں اور ایثار کی درخشندہ مثالیں نظر آتی ہیں لیکن بدقسمتی سے مرور ایام کے ساتھ اور غیر اسلامی اثرات کی بنا پر مسلمان اپنے بزرگوں کے طرز عمل کو بھول گئے۔ اس کے ساتھ غیر اسلامی فلسفوں کے زیر اثر انھوں نے طبقاتی کشمکش کا حل غیروں کے ہاں تلاش کرنا شروع کر دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے غریبی اور امیری کے مسئلے کو جس طرح حل کیا ہے وہ عین فطرتِ انسانی کے بھی قریب ہے اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے۔ اسلام نے ایک طرف فطرتِ انسانی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نجی ملکیّت کا اعتراف کیا ہے اور ذاتی املاک کو محترم گردانا اور اس کے ساتھ ہی اس پر ایسی حدود عاید کیں اور وہ سرمایہ داری کی ستم رانیوں کا خاتمہ کر دیں۔ ذاتی جائیداد کے احترام ہی کے خیال سے امام حسین علیہ السّلام نے کربلا میں پہنچ کر اس زمین کی قیمت یا اجرت ادا کی جہاں انہوں نے خیمے نصب کیے کیونکہ

اسلام میں کسی کی ملکیت پر بغیر اجازت تصرف غضب کہلاتا ہے جس کی شدید ممانعت ہے۔ اسی طرح ذاتی ملکیت پر جو حدود عاید ہوئیں ان سے امراء سرمایہ دار نہیں بن سکتے۔ زکات اور صدقات کو فرائض میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن متقی مسلمان اسی پہ اکتفا نہیں کرتا بلکہ قرآنی احکام پہ عمل پیرا ہو کر اپنی باقیماندہ دولت کو امانت کی حیثیت دیتا ہے اور جب اپنے غریب بھائیوں کی مدد کرتا ہے تو احسان سمجھ کر نہیں کرتا بلکہ اپنا اجتماعی فریضہ شمار کرتا ہے۔

بُخل

باب مدینۃ العلم حضرت علی علیہ السلام نے اپنے خطبات اور اقوال میں بار بار اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ تمام اعمال کی بجا آوری کے وقت ہم اس بات کو فراموش نہ کریں۔ کہ ان اعمال کے نیک یا بد ہونے کا حساب ہمیں دینا پڑے گا اور اس حساب کے وقت کسی قسم کی حیلہ جوئی اور کسی شخص کی وکالت ہمارے کام نہ آئے گی اور پھر جس بات کی جانب انہوں نے بہ تکرار ہمیں متوجہ کیا ہے۔ وہ مال و دولت جمع کرنے کا مسئلہ ہے۔ آج اسی قسم کا ایک قول آپ کے پیش خدمت ہے۔ جس میں حضرت امیرؑ نے نہایت بلیغ انداز میں ہمیں یہ بات سمجھائی ہے کہ غلط ذریعوں سے مال کمانے کا نتیجہ روز قیامت بھگتنا پڑے گا وہ فرماتے ہیں:

اِنَّ أَعْظَمَ الْحَسَرَاتِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ حَسْرَۃُ رَجُلٍ کَسَبَ مَالاً فِیْ غَیْرِ طَاعَۃِ اللّٰہِ فَوَرِثَہٗ رَجُلٌ فَاَنْفَقَہٗ فِیْ طَاعَۃِ اللّٰہِ فَدَخَلَ بِہِ الْجَنَّۃَ وَدَخَلَ الْاَوَّلُ بِہِ النَّارَ۔

یعنی قیامت کے دن سب سے بڑی حسرت اُس شخص کی ہوگی جس نے خدا کی نافرمانی کر کے مال کمایا۔ اور اسے ایک شخص نے ورثے میں حاصل کیا۔ جس نے وہی مال اطاعتِ خُدا میں خرچ کر دیا اور یوں اس مال کی بنا پر وہ جنت میں داخل ہُوا اور پہلا شخص اسی مال کی بدولت جہنم میں گیا۔

اس قول سے پہلی بات تو یہ ظاہر ہوتی ہے کہ اسلام میں مال کمانا منع نہیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ مال احکام خداوندی کے مطابق کمایا جائے یعنی ایسے ذرائع اختیار نہ کئے جائیں جن سے خداوندِ عالم نے منع کیا ہے۔ اسلام میں کسبِ حلال پر بہت زور دیا گیا ہے اور احادیثِ نبویؐ میں بعض مخصوص ذرائع حصول مال کی ممانعت ملتی ہے اور پھر یہ ارشاد نبویؐ تو مشہور ہے:

اَلرَّاشِیْ وَالْمُرْتَشِیْ کِلَاھُمَا فِی النَّارِ۔ یعنی: رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں جہنمی ہیں ـــــــ ذرا اس پر غور فرمائیے کہ حدیثِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

میں پہلے رشوت دینے والے کا ذکر ہے اور پھر رشوت لینے والے کا۔ کیا یہ بات ستم ظریفی کی نہیں کہ ہم رشوت لینے والے کی مذمت تو کریں لیکن رشوت دینے والے کو بری قرار دیں؟ اس جملہ معترضہ سے قطع نظر جناب امیرؑ کے قول سے دوسری بات یہ نکلتی ہے کہ اگر حکم خدا کی خلاف ورزی کر کے مال کمانے والا مر جائے اور وہ مال اس کے وارث حکم خدا کے مطابق خرچ کریں، تو وہی مال انھیں جنّت کا حقدار بنا دے گا۔ لیکن اس کا اصلی مالک اسی مال کی بنا پر جہنم کا مستحق ہوگا۔ اس شخص کی حسرت یہ ہوگی کہ جس مال کی بنا پر وہ جہنم میں جا رہا ہے وہی مال دوسروں کو جنت میں لیے جا رہا ہے۔ ایک اور بات قابل غور یہ ہے کہ جناب امیرؑ اس بات کا ذکر تک نہیں کرتے کہ اگر کوئی نافرمانی خدا کر کے مال کمائے اور پھر راہِ خدا میں خرچ کر دے تو کیا ہو۔؟ اس کا سبب واضح ہے کہ حرام کا مال راہ خدا میں خرچ بھی کیا جائے تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ چوری کر کے، یا رشوت دے کر یا لوگوں کے حقوق غصب کر کے مال کما کر راہ خدا میں خرچ کرنا اسلامی نقطہ نظر سے جائز نہیں۔

جناب امیرؑ کا یہ قول ہماری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہونا چاہئے اور اس پر عمل کرنے سے ہمارے وہ بیشمار اجتماعی مسائل حل ہو سکتے ہیں جن کی اساس حکم خدا کی نافرمانی کر کے مال کمانے اور جمع کرنے پر ہے اگر ہم اس بات کا احساس کر لیں کہ غلط طریقے سے کمایا ہوا مال ہم اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے اور اس کی بنا پر ہم جہنم کے حقدار ہونگے تو پھر اپنی اولاد کو سکھی دیکھنے کا خیال یا جنون ہمیں احکام خداوندی کی خلاف ورزی پر آمادہ نہ کر سکے۔ اسی بات کے پیش نظر حضرت علی علیہ السلام نے ایک بار امام حسنؑ سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ بیٹا! اپنے بعد کوئی دنیاوی چیز چھوڑ کر نہ جانا کیونکہ تم دو قسم کے اشخاص کے لیے یہ چیزیں چھوڑ دگے یا وہ شخص جو ان اشیا کو اطاعت خدا میں استعمال کرے گا اور یہ اس خیر سے فائدہ اٹھائے گا جس کے لیے تم نے مشقت کی اور یا وہ شخص جو اس کو خدا کی نافرمانی میں استعمال کرے گا اور یوں تم اس نافرمانی میں اس کے مددگار بنو گے۔

بخل برائیوں کی جڑ

خلقی خرابیوں اور عیوب میں سے جس عیب کی جناب امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ نے بڑی شدت اور تکرار سے مذمت کی ہے وہ بخل ہے۔ اس خلقی کمزوری یا عیب کو دوسروں نے بھی برا بھلا کہا ہے لیکن عربوں کے ہاں یہ خصوصیت بے حد مکروہ اور مذموم گردانی جاتی تھی۔ خود قرآن مجید نے بخیلوں کی مذمت کی ہے اور ارشاد ربانی ہے:

وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ○

یعنی جن کو اپنے نفس کے بخل سے بچا دیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والوں میں سے ہیں

آج کی اس گفتگو کا موضوع بخل کے بارے میں جناب امیرؑ کے دو قول ہیں۔ پہلا قول تو یہ ہے۔

اَلْبُخْلُ جَامِعٌ لِمَسَاوِي الْعُيُوْبِ وَهُوَ زِمَامٌ يُقَادُ بِهِ إِلَى السُّوْءِ

یعنی بخل تمام عیوب کا مجموعہ ہے اور وہ لگام ہے جس کے ذریعے سے برائی کی طرف لے جایا جاتا ہے —— تو گویا جناب امیر علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق اگر انسان بخل سے نجات حاصل کرلے تو باقی عیوب سے بھی بچ سکتا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ بخل صرف مال کا بخل ہی نہیں ہوتا بلکہ ہر چیز میں بخل آسکتا ہے۔ اصل میں بخل کا مفہوم خرچ نہ کرنا یا کم خرچ کرنا نہیں بلکہ یہ ہے کہ انسان کو کسی چیز کی ضرورت ہو اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے اسباب و وسائل اس کے پاس ہیں لیکن وہ انہیں استعمال کر کے اپنی یا کسی اور کی جائز ضرورت پوری نہ کرے اس میں کم یا زیادہ خرچ کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا مسئلہ صرف ضرورت کا پیدا ہونا اور اسے پورا کرنے کے اسباب کا ہونا ہے اب اگر اس اسباب و وسائل کو استعمال نہ کیا جائے تو بخل کی خصوصیت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک شخص مالدار نہیں اور اس کے لیے یہ ممکن نہیں کہ نہایت عمدہ قسم کا مکان خرید سکے اور اس لیے وہ نہایت خراب وخستہ مکان میں زندگی بسر کرے تو ہم اس کو بخیل نہیں کہہ سکتے۔ اب بخل جناب امیرؑ کے قول کے مطابق تمام دوسرے عیوب کے پیدا ہونے کا سبب ہے۔ بخیل اپنی عزت نفس کو ہاتھ سے دے بیٹھتا ہے

اور معاشرے میں نکما بنتا ہے۔ بیماری کی حالت میں اپنا علاج نہیں کراتا، کھانا نہیں کھاتا اور بیمار پڑ جاتا ہے اسے اپنی غریبی کا یقین دلانے کے لیے جھوٹ بولنا پڑتا ہے غرضیکہ آپ جوں جوں غور فرمائیں توں توں آپ پر یہ بات کھلتی چلی جائے گی کہ ہر خلقی عیب کی بنیاد بخل ہی ہے۔ خوف، بزدلی، کمینگی، بے غیرتی، خوشامد پسندی وغیرہ وغیرہ تمام عیوب اسی بخل کے سبب پیدا ہوتے ہیں۔ اب جناب امیرؑ کا ایک اور قول سماعت فرمایئے۔

عَجِبْتُ لِلْبَخِيْلِ يَسْتَعْجِلُ الْفَقْرَ الَّذِيْ مِنْهُ هَرَبَ وَيَفُوْتُهُ الْغِنَى الَّذِيْ إِيَّاهُ طَلَبَ فَيَعِيْشُ فِى الدُّنْيَا عَيْشَ الْفُقَرَاءِ وَيُحَاسَبُ فِى الْآخِرَةِ حِسَابَ الْاَغْنِيَاءِ۔

یعنی مجھے بخیل شخص پر تعجب ہوتا ہے کہ جس محتاجی سے وہ بھاگا تھا اسی کو حاصل کرنے میں جلدی کرتا ہے اور جس غنا اور عدم احتیاج کا وہ طالب تھا وہ اسے مل نہیں پاتی اس لیے وہ دنیا میں تو فقراء کی سی زندگی بسر کرتا ہے لیکن آخرت میں اس سے اغنیاء کا سا حساب لیا جائے گا

دوسرے لفظوں میں بخیل ایک نفسیاتی تناقض کا شکار ہوتا ہے وہ بخل اس لیے کرتا ہے کہ وہ کہیں محتاج نہ ہو جائے لیکن وہی بخل اسے بروقت محتاجی اور فقر میں مبتلا رکھتا ہے کیونکہ ضرورت کے وقت وہ سدّ ضرورت کے اسباب صرف نہیں کرتا یوں وہ دنیا میں فقیروں اور محتاجوں کے مانند زندگی بسر کرتا ہے لیکن قیامت کے دن جب ان سے حساب لیا جائے گا۔ تو وہی ہوگا جو اغنیاء سے لیا جائے گا۔ گویا بخیل دنیا اور آخرت دونوں میں گھاٹے میں ہے۔ اس کی خلقی کمزوریوں اور عیبوں کی بنا پر اس کے ہم قوم اس سے نفرت کرتے ہیں اور قیامت کے دن اس کے لیے کفرانِ نعمت کی سزا مقدر ہے اس قول کے ذریعے سے در اصل جناب امیر علیہ السلام یہ فرما رہے ہیں کہ جب قیامت کے دن تمہیں ان اسباب راحت کا حساب دینا ہی ہے جو تمہارے پاس ہیں تو پھر ان اسباب حکم الہی کے مطابق اپنے لیے اور دوسروں کے لیے استعمال کرو تاکہ روز حساب سرخرو ہو سکو اور اس کے ساتھ ان اعمال نیک کی جزا بھی حاصل کر سکو۔ جو بخل کو ترک کر کے اپنے پاس جمع شدہ اسباب و وسائل کو خلق خدا کی بہبود کے لیے خرچ کر کے تم بجا لائے ہو تو گویا اس قول میں جہاں نہایت عمدہ طریقے پر بخل کی مذمت کی گئی ہے۔

وہاں جود وسخا اور انفاق کی تلقین بھی موجود ہے اور قولِ خداوندی کے مطابق لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا ۔ تم نیکی حاصل کر نہیں کر سکو گے جب تک راہِ خدا میں خرچ نہ کروگے
پھر قرآن مجید میں یہ ارشاد باری ہے :

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۣ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ لا يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۔

ہلاکت ہے ہر اس چغل خوری کرنے والے اور طعنہ دینے والے کے لیے مال جمع کرتا اور گنتا رہتا ہے وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اسے بقا دیگا۔

اور اس ارشاد ربانی کی روشنی میں اور قول علوی کی ہدایت میں ہم مال کمانے اور خرچ کرنے کے بارے میں ایک واضح اسلامی طریقہ کار کو حاصل کرتے ہیں۔

ذخیرہ اندوزی

جناب امیر علیہ السلام نے اپنے ایک گورنر مالک الاشتر کو ایک طویل فرمان جاری کیا ہے جس میں انہوں نے مالک اشتر کو انتظامیات کے بارے میں ہدایات دی ہیں۔ اس فرمان میں اسلام کے تصورِ انتظامیات پر کھل کر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مالک اشتر کو مختلف قسم کی ہدایات دیتے ہوئے انہوں نے مالک سے کہا ہے کہ وہ تاجروں اور صنعت کاروں کا خاص طور پر خیال رکھیں۔ تاجروں کے بارے میں مختلف سفارشات دیتے ہوئے جہاں جناب امیرؑ نے انہیں مراعات دینے کا حکم دیا ہے وہاں ان کی نگرانی کرنے کا امر بھی فرمایا ہے۔ انہی احکام میں ایک حکم احتکار کی ممانعت ہے۔ احتکار کے معنی موجودہ زمانے کی اصطلاح کے مطابق ذخیرہ اندوزی کے ہیں کہ تاجر نفع حاصل کرنے کے لیے اپنا مال چھپالے اور اس وقت بیچے جب اس کی قیمت پہلے کے مقابلے میں بہت بڑھ جائے۔ جناب امیرؑ کا ارشاد ہے فامنع من الاحتکار فان رسول اللہ۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ منع منہ۔ اس قول کا ترجمہ یہ ہے کہ ذخیرہ اندوزی کو روک کیونکہ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے روکا ہے۔ اسی طرح عبداللہ ابنِ عباس کو ایک خط میں یہ حکم دیا ہے کہ یہ ذخیرہ اندوزی کی سختی سے روک تھام کریں۔ کیونکہ حضورؐ نے ذخیرہ اندوزوں پر لعنت ڈالی ہے۔ آج کی گفتگو اسی قول کے بارے میں ہوگی۔

یہ بات زیادہ بحث طلب نہیں کہ انسانی فرد معاشرے کے بغیر نہ زندہ رہ سکتی ہے اور نہ پھل پھول سکتی ہے۔ کیونکہ انسان جبلی طور پر اجتماع پسند ہے اور تمام جانداروں کے مقابلے میں انسانی بچہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے سب سے زیادہ وقت لیتا ہے اب انسانی معاشرے کی اساس اس بات پر ہے کہ افراد اپنی ذاتی خواہشات اور میلانات کا کچھ حصہ معاشرے کی تشکیل، اس کی بقاء اور اس کے استمرار کے لیے قربان کریں اور معاشرہ

اس کے عوض میں انہیں اجتماعی تحفظ اور اپنے مخفی جوہروں کو صیقل کرنے کا موقع دیتا ہے دوسرے الفاظ میں انسانی معاشرہ باہمی تعاون اور تضامن کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے لیکن اگر کچھ افراد دوسرے افراد کو یہ تعاون نہ دیں تو پھر معاشرے کا نظام بگڑ جاتا ہے اور ٹوٹ پھوٹ کا عمل ظاہر ہو جاتا ہے۔ اسی تعاون کو ایک شکل تقسیم کار کی صورت اختیار کرتی ہے یعنی افراد معاشرہ اپنے درمیان کام بانٹ لیتے ہیں۔ کچھ لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں کچھ صنعتوں میں مشغول ہو جاتے ہیں، کچھ تعلیم و تدریس کا کام کرتے ہیں۔ اس طرح معاشرے میں مختلف گروہ اور طبقات رونما ہوتے ہیں، جن کے باہمی تعاون سے معاشرتی رشتے مضبوط ہو جاتے ہیں۔ اور معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے لیکن جب تعاون کے رشتے کمزور پڑ جائیں اور اجتماعی مفاد کو اپنے ذاتی منفعت کے لیے قربان کر دے تو پھر آہستہ آہستہ اجتماعی تار و پود بکھرنا شروع کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر معاشرے کے کچھ افراد اپنے ذمے تدریس کا کام لے لیں۔ لیکن معاشرہ ان کی جائز ضروریات کو پورا نہ کرے تو وہ افراد اپنی تمام تر خواہشات کے باوجود مجبور ہو جائیں گے کہ وہ تدریس کا کام ترک کر کے اپنی ضروریات کو پورا کریں ضروریات کے ہونے اور ان کے پورا ہونے کے وسائل کی عدم موجودگی کو فقر کہا جاتا ہے یعنی معاشرہ کسی فرد کو اس کی ضروریات کے حصول میں مدد دینے سے قاصر ہے۔ یہ فقر افراد کو انحراف اور بے راہ روی کا راستہ دکھاتا ہے اسی لیے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ عجبت لقوم فیہ فقر ولا کفر یعنی مجھے اس قوم پر تعجب ہے جس میں فقر تو ہے لیکن کفر نہیں۔

تاجر طبقہ معاشرے کا بیحد اہم طبقہ ہے کیونکہ ان کے وسیلے سے افراد معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی گھر بیٹھے حاصل کر لیتے ہیں۔ ورنہ انہیں اپنا کام کاج چھوڑ کر مختلف جگہوں پہ جانا پڑے تاکہ وہ چیزیں حاصل کر سکیں۔ تاجر افراد معاشرہ کو ان کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرتے ہیں اور اس کے عوض میں معاشرہ سے نفع طلب کرتے ہیں اور یہ ان کا حق ہے اسلام میں تجارت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے اور تاجروں کو مال خریدنے اور بیچنے کی پوری آزادی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ شرط ہے کہ وہ اسلام کے اصول عدل، معاشرتی تعاون،

اور اخوت کے جذبات کا احساس کریں۔ ان کا تقاضا یہ ہے کہ تاجر افراد معاشرہ کو ان کی ضروریات کے مناسب نفع پر مہیا کریں۔ لیکن جب وہ مناسب نفع کی بجائے زائد نفع کی خواہش میں اپنا مال روک لے اور فروخت نہ کرے تو افراد معاشرہ کی ضروریات پوری نہیں ہوسکتیں۔ اسلام مغربی اقتصادیات کے اصول طلب و رسد کا قائل نہیں۔ مغرب کی آزاد تجارت کے اصول فرد کی پرورش کے لیے ہیں لیکن اسلامی تجارت کے اصول اجتماع کی بہبود کے لیے ہیں اور اجتماعی بہبود کے لیے فرد کی قربانی دینا سکھایا گیا ہے۔ یہ قربانی مال کی بھی ہوسکتی ہے اور جانوں کی بھی۔ جب کوئی تاجر اجتماعی مفاد کو نظر انداز کرکے صرف اپنی ذات کی پرورش کرنے کیلئے دوسروں کو ان کی ضروریات زندگی سے مہیا کرتا ہے، اور انہیں مجبور کرتا ہے۔ اور اس کی منافع خوری کی خواہشات کے سامنے سر جھکا دیں تو وہ دراصل اجتماعی نظام کو زد پہنچا رہا ہے۔ اس لیے اسلام میں احتکار کی شدید مخالفت کی گئی ہے۔ جناب امیرؑ نے اپنے قول میں حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا حوالہ دیا ہے اور اسی حدیث کی طرف امام غزالی علیہ الرحمۃ نے بھی احیاء علوم الدین میں اشارہ کیا ہے کہ کہا ہے کہ ذخیرہ اندوزی کرنے والے خدا کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کے مرتکب ہیں اور ان کے سب اعمال باطل ہیں۔

اس ذخیرہ اندوزی اور احتکار کے مفہوم کو ذرا وسعت دی جائے تو اس کا اطلاق صرف تاجروں ہی پر نہیں ہوتا بلکہ ہر اس شخص پر ہوتا ہے جو اپنے معاشرہ کو کچھ دے سکے اور اپنی ذات کی خاطر اپنا ہاتھ روک لے۔ ان لوگوں میں اساتذہ بھی شامل ہیں صنعتکار بھی شامل ہیں، کاریگر بھی شامل ہیں اور ڈاکٹر بھی شامل ہیں خدا ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

شدید ترین گناہ

انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بہت سی خرابیاں اس لیے پیدا ہوتی ہیں۔ کہ ہم بعض باتوں کو معمولی سمجھ کر برداشت کر لیتے ہیں یا یہ خیال کرتے ہیں کہ اب اتنی چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بنانا بے کار ہے اس سے درگذر کرنا ہی بہتر ہے لیکن انسانی تاریخ کا تجزیہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انسان کا یہ رویہ کہ چلو چھوڑو دفع کرو۔ جانے بھی دو اتنی سی بات پر کیا شور مچانا بعض اوقات نہیں اکثر اوقات بڑی مشکلات کا باعث بنتا ہے۔ جناب امیر علیہ السلام کے کلام بلاغت نظام میں کہ آئینہ دار بلاغت نبوی صلعم ہے جہاں اور باتوں پر روشنی ڈالی گئی وہاں اجتماعی مسائل کے بارے میں بھی ہماری راہ میں رشد و ہدایت کی مشعلیں روشن کی گئی ہیں۔ آج ہم اسی موضوع پر جناب امیرؑ کا قول پیش کر رہے ہیں اور وہ یہ ہے۔ کہ أَشَدُّ الذُّنُوبِ مَا اسْتَهَانَ بِهِ صَاحِبُهُ یعنی شدید ترین گناہ وہ ہے جسے اس کا مرتکب معمولی گردانے۔ دوسرے لفظوں میں چھوٹے سے چھوٹا گناہ اور معمولی سی بدعملی بھی اس وقت شدید ترین گناہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے جب اس کا ارتکاب کرنے والا اسے معمولی بات اور اصول کی ادنیٰ خلاف ورزی گردانے۔ ذرا غور فرمایئے کہ حضرت علی علیہ السلام نے ان گناہوں کو اشد الذنوب قرار نہیں دیا۔ جنہیں عام فقہی اصطلاح میں گناہ کبیرہ کہتے ہیں۔ پھر انہوں نے یہاں ذنوب کا لفظ استعمال کیا ہے جو اثم سے مختلف ہے اور اس میں وہ اعمال بھی شامل ہو سکتے ہیں جو بے خیالی میں انسان سے سرزد ہو جائیں۔ پھر وہ شدید ترین ذنب یا غلط کاری یا بدعملی یا گناہ اس عمل کو قرار دیتے ہیں جسے اس کا کرنے والا معمولی گردانے۔ بظاہر یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن اس پر غور فرمایئے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ باب مدینۃ العلم نے ہمیں ایک نفسیاتی اور اجتماعی حقیقت کا سراغ دیا۔ انفرادی یا اجتماعی عاداتِ بد ابتداء میں بے خیالی ہی کا نتیجہ ہوتی ہیں ان کے ارتکاب میں بدنیتی شامل نہیں ہوتی لیکن اگر انہیں معمولی سمجھ کر کرنے والا ان کی طرف دھیان نہ دے یا کوئی اور شخص اسے ان کے ارتکاب سے روکے نہیں تو وہ عادات اتنی پختہ ہو جاتی ہیں کہ پھر ان سے پیچھا

چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ہر تہذیب اور ہر معاشرے میں آدابِ مجلس کے بارے میں بڑی تاکیدیں ملتی ہیں مثال کے طور پر کھانا کھاتے وقت منہ سے چپ چپ کی آواز پیدا کرنا۔ یہ حرکت بظاہر بے ضرر معلوم ہوتی ہے لیکن کم از کم اسلامی کتبِ اخلاقیات میں اس کی مذمت کی گئی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ جب کوئی شخص یہ حرکت کرتا ہے تو گویا وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اسے دوسروں کا کوئی خیال نہیں۔ اگر اسے اس بات سے روکا نہ جائے تو گویا ہم اس کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں کہ وہ اپنے ساتھیوں کا خیال رکھے بغیر اپنا کام کرتا رہے۔ یہ چیز غیر شعوری طور پر اسے اجتماعی قواعد و ضوابط کی پابندی نہ کرنے پر اکسائے گی اور یوں اسے جرم کرنے کی تربیت ملتی رہے گی۔ یہ ایک معمولی مثال ہے۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں آپ کو اپنے اردگرد کی زندگی میں مل سکتی ہیں۔ اور پھر یہ بھی پتہ چل سکتا ہے کہ اس قسم کی اجتماعی یا انفرادی عاداتِ بد کس طرح معاشرے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ٹریفک کے اصولوں کی خلاف ورزی، کم تولنا، وقت کی پابندی نہ کرنا، اپنا کام دلجمعی سے سرانجام نہ دینا، دوسروں کے کام میں دخل اندازی اور اسی قسم کی اور باتیں ہم معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں اور ان کا اثر ہمارے معاشرے پر واضح طور پر موجود ہے۔ ان بُرے اثرات کو قانون یا حکومتِ وقت کی سختی دُور نہیں کر سکتی۔ اس قسم کی خرابیوں کا علاج قولِ علیؑ پر غور کرنے ہی سے مل سکتا ہے کہ خود کرنے والا ان باتوں کو معمولی سمجھ کر یہ نہ کہتا پھرے کہ آخر اتنی سی بات پر کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔

جانوروں کے ساتھ سلوک

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث میں جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی بیحد زیادہ تلقین کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں آج ہم حضرت علی علیہ السلام کا ایک قول پیش کر رہے ہیں اور وہ اس خیال سے کہ حضرت علیؑ بھی تو چشمہ اخلاق محمدیہ سے سیراب ہوئے ہیں وہ فرماتے ہیں۔

اِرفق بالبہائم ولا تسوء بلحمہا ولا تحمّل علیہا فوق طاقتہا
جانوروں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرو۔ ان کو زخم مت پہنچاؤ اور ان پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ لادو۔

حضرت علی علیہ السلام کا یہ مشورہ ہر دور میں کارآمد ہے لیکن ہمارے ہاں تو شاید اس کی بے حد ضرورت ہے ذرا اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالئے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ ہمارے ہاں جانوروں کے ساتھ سلوک نہیں ہوتا۔ ذرا تانگوں اور ریڑھوں پر نظر ڈالیے۔ بیل گاڑیوں کو دیکھیئے۔ اور پھر اندازہ لگائیے کہ ان بے زبان جانوروں پر کس قدر ظلم ہوتا ہے صرف یہی نہیں بعض لوگ صرف اپنا وقت گذارنے کے لیے پرندوں اور چوپایوں کا بے تحاشہ شکار کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ہیں کہ محض دل خوش کرنے کے لیے بلیوں اور کتوں اور دیگر جانوروں کو تنگ کرتے ہیں۔ چڑیا گھر جانے والے وہاں پر مقید جانوروں کو طرح طرح سے ستاتے ہیں اور کوئی انہیں منع نہیں کرتا۔ جب بیرونی ممالک کے لوگ ہماری یہ حالت دیکھتے ہیں تو انہیں یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ شاید مسلمانوں کی ثقافت میں جانوروں کو تنگ کرنا شامل ہے حالانکہ معاملہ بالکل الٹ ہے۔

شاید ہی کوئی مذہبی کتاب ہو جس میں جانوروں کی قسم کھائی گئی ہو۔ لیکن قرآن مجید میں سورہ والعادیات میں گھوڑوں کا نام لے کر خداوند عالم نے قسم کھائی ہے۔ انکے دوڑنے

ان کے سموں سے نکلنے والے شراروں کی قسم کھا کر خداوند عالم نے ہمیں ان جانوروں کی اہمیت کا احساس دلایا ہے۔ اسلامی تاریخ ان جانوروں کے تذکرے اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جنہیں مسلمان جنگوں میں استعمال کرتے تھے۔ یہ صرف اسلامی روایات ہی ہیں جن میں جانوروں کو یوں اہمیت دی گئی۔ ہمیں حکم ہے کہ جب کوئی جانور ذبح کریں تو پہلے اسے پانی پلائیں، ان کو ذبح کرنے کے لیے جو چھری یا کوئی اور آلہ استعمال ہو وہ تیز ہو تاکہ جانور کو تکلیف نہ ہو اسی طرح یہ بھی حکم ہے کہ ایک جانور کو دوسرے کے سامنے ذبح نہ کرو۔ ان تمام احکام سے بنیادی مقصد جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے اپنے اس قول میں تین باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے ایک تو یہ ہے کہ جانوروں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرو۔ اس میں بہت سی باتیں شامل ہیں، انہیں تنگ نہ کرنا بھی شامل ہے، انہیں بے تحاشہ نہ مارنا بھی شامل ہے۔ ان کے لیے دانے پانی کا انتظام کرنا بھی شامل ہے اسی طرح لا تسوء لحمها میں یہ بات شامل ہے کہ جانوروں کے جسم پر زخم نہ لگائے جائیں اور اگر کوئی زخم لگ جائے تو اس کا علاج کیا جائے۔ پھر حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ ان جانوروں کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ لادا جائے تاکہ انہیں تکلیف نہ ہو۔ ان سب باتوں کا سبب ظاہر ہے اگر ہم ان جانوروں کے ساتھ برا سلوک کریں گے تو آہستہ آہستہ ان کی تعداد کم ہوتی جائے گی اور بالآخر معاشرے کو اس کا نقصان اٹھانا پڑے گا اسی نقطہ نظر سے حضرت علی علیہ السلام نے اپنے ایک اور قول میں یہ نصیحت فرمائی ہے کہ:

> لَا تَجْعَلُوْا بطونکم مقابر الانعام یعنی اپنے پیٹوں کو جانوروں کا مقبرہ نہ بناؤ۔

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم گوشت کھانے میں اسراف سے کام نہ لیں کیونکہ اس طرح ذبح ہونے والے جانوروں کی تعداد بڑھتی چلی جائے گی، اور اس کا نتیجہ گوشت کی قلت کی صورت میں نمودار ہو گا۔

اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ہمیں بے شمار گھوڑوں، خچروں اور اونٹوں کا

تذکرہ ملتا ہے جن کے ساتھ مسلمانوں نے اچھا سلوک کر کے مثالیں قائم کی ہیں۔ حضرت نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی اونٹنی قصواء اور امام حسین علیہ السلام کے گھوڑے ذوالجناح کا ذکر ہماری تاریخ اور ثقافت کا حصّہ بن چکا ہے۔

اس لیے مسلمان ہونے کی حیثیت میں ہم سب کا فرض ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی اس مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک کر کے اپنے خالق کا شکریہ ادا کریں جس نے ان کو ہماری خدمت کے لیے پیدا فرمایا۔

حاکم کے فرائض

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے خطبات و مکاتیب کے مجموعے نہج البلاغہ میں ایک طویل حکمنامہ ہے جو انہوں نے اپنے گورنر مالک اشتر کو اس وقت دیا جب وہ مصر کی گورنری کا عہدہ سنبھالنے کے لیئے جا رہے تھے۔ یہ حکم نامہ اسلامی اصولِ انتظامیات کی بڑی اہم دستاویز ہے اس پر جناب امیر علیہ السلام نے انتظامیات کے بارے میں بنیادی اصول وضع کر کے رکھ دیئے ہیں۔ آج کی گفتگو میں ہم اسی دستاویز کا اقتباس پیش کر رہے ہیں جس کا تعلق حاکم کے فرائض سے ہے اور جس کا اطلاق ہر سسٹم کے ناظم اور رئیس محکمہ پر ہو سکتا ہے۔ اقتباس یہ ہے۔

"واُجعَل لِذوي الحاجات منك قِسْمًا تُفرّغ لهُمْ فيه شخصكَ وتجلسْ لهُمْ مجلسًا عامًا فتتواضع فيه لِله الَّذِيْ خلقكَ، وتُقعِدَ عنهم جندكَ و اعوانكَ من أحراسِكَ وشرطكَ حتى يُكلّمكَ مُتكلّمهُم غير مُتتَعْتِع فاني سَمِعْتُ رسول الله صلى الله عليه واله وسلم۔ بقول في غير موطن " لن تقدّسَ امة لا يوخذ للضّعيف فيها حقّه من القوي غير مُتتعتع"

اس اقتباس کا ترجمہ یوں کیا جا سکتا ہے: اور حاجت مندوں کے لیے اپنے وقت کا کچھ حصہ الگ کر دے جس میں تو اپنے آپ کو ان کے لیے فارغ کر ان کے ساتھ ایک مجلسِ عام میں اس اللہ کی خاطر بیٹھ جس نے تجھے پیدا کیا ہے اور اس وقت تو اپنے سپاہیوں، چوکیداروں اور معاونوں کو الگ کر دے تاکہ ان حاجت مندوں کے نمائندے تجھ

سے بغیر ہچکچاہٹ کے بات کر سکیں کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کئی مرتبہ سنا ہے کہ اس امت کو خدا پاکیزگی نہیں دیتا جس میں ضعیف کا حق قوی سے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے چھین نہ لیا جائے"۔ اس قول میں جناب امیر علیہ السلام نے انتظامیہ کے افسروں کو یہ بات سمجھائی ہے کہ وہ عوام الناس کی شکایات سننے کے لیے اپنے وقت کا کچھ حصہ معین کریں اور جب وہ لوگ شکایات کر رہے ہوں اور اپنی حاجتیں بیان کر رہے ہوں۔ اس وقت دوسرے سرکاری عہدہ دار موجود نہ ہوں کیونکہ ان کی موجودگی کی بنا پر شکایت کرنے والا کھل کر شکایت نہیں کر سکے گا۔ یہ اصول جدید دور میں نظری طور پر اپنایا گیا کہ سرکاری افسر عام کچہریاں لگاتے ہیں کہ عوام الناس اپنی شکایات کر سکیں۔ اور افسران کا ازالہ کر سکیں اور یوں ملک میں عدل و انصاف قائم کیا جا سکے۔ اگر عوام الناس کو شکایات بیان کرنے اور دادرسی حاصل کرنے کا موقع نہ دیا جائے تو پھر ان میں اپنے افسر یا حاکم کے خلاف ایک کدورت سی پیدا ہو جائیگی اور یہ بات ملک میں امن و امان اور سلامتی کے لیے خطرہ ہوگی۔ اس قول کے آخر میں جو حدیث رسولؐ مقبول بیان کی گئی ہے۔ وہ قیامت تک کے لیے ہر قوم کے واسطے مشعلِ ہدایت ہے اور اس کا ماحاصل یہ ہے کہ اگر کسی قوم میں طاقتوروں سے وہ حقوق واپس نہ لیے جائیں جو انہوں نے کمزوروں سے چھین لئے تھے اس وقت تک اس قوم کو پاکیزگی میسر نہیں ہو سکتی یعنی وہ قوم بحیثیت قوم کے ترقی نہیں کر سکتی۔

جہاد ۱

حضرت علی علیہ السلام کے اقوال کا کچھ حصہ جو نہج البلاغہ کے نام سے الشریف رضی رح نے مدون کیا حکمت و دانش اسلامی اور بنیش و بصیرت روحانی کا ایک عجیب و غریب مرقع ہے اور اس میں زندگی کے بارے میں ایسی ایسی بصیرت افروز باتیں ملتی ہیں کہ قاری انگشت بدنداں رہ جاتا اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر شاگرد علم و فضل کی اس ارفع و اعلیٰ سطح پر ہے تو اُن کے اُستاد اور رہنما جناب سرور کائنات ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کس مقام عالی پر فائز ہوں گے کہ خود حضرت علی علیہ السلام نے بار بار اس امر کو دہرایا ہے کہ انھوں نے جو کچھ حاصل کیا وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فیض تربیت کا صدقہ ہے۔

حضرت امیر علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

فَاِنَّ الْجِهَادَ بَابٌ مِنْ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ فَتَحَهُ اللّٰهُ لِخَاصَّةِ اَوْلِيَاۤئِهٖ وَهُوَ لِبَاسُ التَّقْوٰى وَدِرْعُ اللّٰهِ الْحَصِيْنَةُ وَ جُنَّتُهُ الْوَثِيْقَةُ وَمَنْ تَرَكَهُ رَغْبَةً عَنْهُ اَلْبَسَهُ اللّٰهُ ثَوْبَ الذُّلِّ وَشَمَلَهُ الْبَلَاۤءُ وَدُيِّثَ بِالصَّغَارِ وَالْقَمَاۤءِ۔ ضرب على قلبه بالاسهاباب واُدِيْلَ الْحَقُّ منه تضييع الجهاد وسيم الخسف ومنع النّصف۔

اس قول کا ترجمہ یوں ہو سکتا ہے کہ:

جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص دوستوں کے لیے کھول رکھا ہے یہ تقویٰ کا لباس ہے۔ حق تعالیٰ کی مضبوط زرہ اور قوی سپر ہے جو کوئی اس سے نفرت کر کے اسے چھوڑ دیتا ہے تو خدائے بزرگ و برتر اسے لباس ذلت و خواری پہناتا ہے۔ بلا میں مبتلا و پریشان اور بدنامی و رسوائی میں گرفتار کر دیتا ہے۔ اس کے دل پر بے عقلی کے پردے ڈال دیئے جائیں گے اور

جہاد نہ کرنے کی بنا پر راہِ حق سے دُور ہو جائے گا اور راہِ باطل پر چلنے لگے گا اور نکبت و بے چارگی میں مبتلا اور عدل و انصاف سے محرُوم ہو جائے گا۔

حضرت علی علیہ السلام کا وہ خطبہ جس میں یہ قول نقل کیا گیا ہے عربی فصاحت و بلاغت و خطابت کا بے مثال نمونہ ہے اور عرب ممالک کی بیشتر یونیورسٹیوں کے عربی ادب کے نصاب میں شامل ہے اس خطبے میں جناب امیر علیہ السلام نے اسلام کے ارکان اساسی میں سے ایک عظیم رکن کے بارے میں جو وضاحتیں فرمائی ہیں ان سے اسلام کے تصوّرِ جہاد کی روشن تصویر کا سراغ ملتا ہے۔ اور مغرب کے متعصب اہلِ قلم کے ان الزامات کا بھانڈا پھوٹتا ہے جو انہوں نے اسلام کے تصورِ جہاد پر وارد کئے ہیں۔ اسلام دشمن مصنّفین نے پوری کوشش کی ہے کہ اسلام کو ایک ایسے دین کے طور پر پیش کریں جس میں مار دھاڑ اور جارحیّت جزوِ لازم ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں جہاد صرف قتال یعنی جنگ تک محدود نہیں بلکہ قتال تو جہاد کا صرف ایک حصّہ ہے اور محض دفاعی اور احتیاطی نوعیت کی لڑائی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ بدر سے واپسی پر مسلمانوں سے صاف طور پر ارشاد فرمایا: کہ ہم جہادِ اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹے ہیں خود حضرت علیؑ کے اقوال میں اس ارشاد کی تفسیر ملتی ہے اور معلوم ہُوا کہ اسلامی جہاد صرف لڑائی کا نام نہیں امام حسین علیہ السلام کے اقوال میں یہ بات موجود ہے کہ ایک شخص نے ان سے دریافت کیا۔ جہاد سنت ہے یا فرض؟ تو امام حسین علیہ السلام نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جہاد کی چار شکلیں ہیں دو فرض ہیں اور دو سنّت۔ فرض قسموں میں سے ایک قسم کے بارے میں انہوں نے فرمایا:۔

فاما احد الفرضين فجهاد الرجل نفسه معاصى الله وهو اعظم الجهاد: یعنی: جہاد کی فرض اقسام میں ایک وہ ہے جس میں انسان اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے کے لیے اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے اور وہ جہاد کی عظیم ترین شکل ہے۔

فرض اقسام میں سے دوسری قسم امام حسین علیہ السلام کے قول کے مطابق وہ جہاد ہے جو تمام امت پر فرض ہے اور وہ دشمن کا مقابلہ کرنا ہے ارشاد ہے: کہ

ان مجاهدة العدو فرض على جميع الامة ولو تركوا الجهاد

لأتاهم العذاب۔

یعنی دشمن کا مقابلہ کرنا تمام امت پر فرض ہے اور لوگ اس جہاد کو ترک کردیں تو ان پر عذاب نازل ہوگا۔

یہ عذاب جناب امیر علیہ السلام کے قول کے مطابق یہ ہے کہ تارکین جہاد کو ذلت و بے عزتی کا سامنا کرنا پڑے گا بدنامی و رسوائی اس کا نصیب ہوگی۔ کیونکہ اگر دشمن کا مقابلہ نہ کیا گیا تو وہ غلبہ حاصل کر کے مسلمانوں کو اپنا غلام بنا لے گا۔ اور ان کے معاشرے کو مبتلائے فساد کردے گا۔ یوں مسلمان اس قابل نہ ہوں گے کہ احکام خداوندی کی پیروی کرسکیں اس طرح سے وہ راہِ حق سے دور ہو کر طریق باطل پر چلنا شروع کردیں گے۔ اور ان کی زندگیاں نکبت و بیچارگی و بے بسی کا مرقع بن جائیں گی اور وہ عدل و انصاف کی بھیک مانگتے رہیں گے۔ اور کوئی شخص ان کے کشکول گدائی میں انصاف کی خیرات نہ ڈالے گا۔

جہاد کی قسموں میں ایک اور قسم یہ ہے انسان سنّتِ نبویؐ کا احیاء کرے جو افضل اعمال ہے کہ حدیث نبوی میں وارد ہوا کہ:

من سن سنة حسنة فلهٗ اجرها واجر من عمل بها الی یوم القیامة من غیر ان ینقص من اجورهم شیئاً۔

یعنی جس نے کسی سنت کو اختیار کیا تو اسے اس کا اجر ملے اور جب لوگ اس پر عمل کریں گے تو قیامت تک اسے اس کا بھی اجر ملتا رہے گا لیکن عمل کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔

یوں معلوم ہوا کہ مسلمان ہر آن اور ہر لحظہ جہاد کر سکتے ہیں کیونکہ جہاد صرف لڑائی کا نام نہیں لہٰذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم جہاد صرف اس وقت کر سکتے ہیں جب لڑائی کا موقع ہو بلکہ اس کے علاوہ بھی اپنے نفس کے خلاف جہاد کرکے اور سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اختیار کرکے ہم جہاد کا فریضہ ادا کر سکتے ہیں اور یوں مسلمان کی زندگی کا ہر ہر لمحہ جہاد کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔

جہاد ۲

جہاد ارکان اسلام میں سے ایک بہت بڑا رکن ہے اور خداوند عالم نے قرآن مجید میں واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے کہ خدا کے نزدیک جہاد کرنے والے ان لوگوں سے افضل ہیں جو گھر میں بیٹھے رہتے ہیں۔ مجاہدین کی تعریف میں قرآن و حدیث میں بیشمار آیات اور اقوال موجود ہیں اور مختلف طریقوں سے لوگوں کو جہاد پر اکسایا گیا ہے یہاں تک کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں ان کو مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں۔ لیکن لوگوں کو اس کا شعور نہیں ہے جناب امیر کے کلام میں بھی جہاد پر بہت زور دیا گیا ہے۔ وہ خود صفِ اوّل کے مجاہد تھے اور انھوں نے اپنی تمام زندگی جہاد فی سبیل اللہ میں گذاری خود ان کا قول ہے کہ "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں علی ابن ابی طالب کی جان ہے۔ وقتِ جہاد مجھے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ میں موت پر جا پڑتا ہوں یا موت مجھ پر آن پڑتی ہے۔ اسی بنا پر جب جناب امیر لوگوں کو جہاد سے گریز کرتے ہوئے پاتے ہیں تو انہیں بڑی الجھن ہوتی ہے اور وہ انہیں مختلف طریقوں سے سمجھاتے ہیں کہ جہاد سے بھاگنا مردوں کی شان نہیں ایک مقام پر ان کا ارشاد ہے:۔

" فَاِنَّ الجِهَادَ بَابٌ مِن اَبوابِ الجَنَّةِ ، فتحهُ اللهُ لخاصَّةِ اولیاءہ ، وهو لباسُ التَّقوىٰ ، ودِرع اللّٰه الحَصِيْنَةُ وَجُنَّتُهُ اَلوَثِيقَةُ فَمَنْ تركهُ رغبَةً عَنْهُ اَلْبسهُ اللّٰهِ ثوبَ الذُّلِّ "

اس کا ترجمہ یوں ہو سکتا ہے: کہ جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے خاص اولیاء کے لیے کھول رکھا ہے۔ جہاد اہلِ تقویٰ کا لباس ہے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ وہ زرہ ہے جو بہت مضبوط ہے اور وہ ڈھال ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اس لیے جو شخص جہاد کو

جان بوجھ کر ترک کرتا ہے۔ خداوند عالم اس کو ذلت کا لباس پہنا دیتا ہے۔

جناب امیرؑ کا وہ خطبہ جس میں سے یہ اقتباس لیا گیا ہے عربی زبان کے ان مشہور خطبات میں سے ہے جن میں فصاحت و بلاغت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ اس قول میں جناب امیرؑ نے ان لوگوں کو خبردار کیا ہے۔ جو لوگ موت کے ڈر سے جہاد کو ترک کرتے ہیں اور کہا ہے کہ اگر تم اسے ترک کروگے تو خداوند عالم تمہیں ذلت و بے آبروئی میں مبتلا کردے گا۔ حضرت علیؑ کا یہ رویہ روح اسلامی کی آئینہ داری کرتا ہے کیونکہ قتال فی سبیل اللہ ہی وہ سطح ہے جس پر انسان اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ اس کا ایمان پختہ ہے جناب امیرؑ جب لوگوں کو جہاد سے کتراتے ہوئے دیکھتے ہیں تو انہیں افسوس بھی ہوتا ہے، اور تعجب بھی اسی جذبے کا اظہار انہوں نے ایک اور مقام پر یوں کیا ہے۔

"این القوم الذین دعوا الی الاسلام فقبلوہ و قروؤا القرآن فاحکموہ و ھیجوا الی الجہاد فولھوا وله اللقاح الی اولادھا"

جناب امیرؑ فریاد کے لہجے میں ارشاد فرماتے ہیں کہاں ہے وہ قوم جن کو اسلام کی دعوت دی گئی اور انہوں نے اسے قبول کیا۔ جنہوں نے قرآن کو پڑھا اور اس پر عمل کیا اور جن کو جہاد کے لیے ابھارا گیا تو وہ جہاد کے لیے یوں دوڑے جس طرح اونٹنی اپنے بچوں کو خطرے میں دیکھ کر ان کی طرف دوڑتی ہے۔"

جہاد مسلمانوں کی ہر دور کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر آج مسلمانوں کو اس کی اشد ضرورت ہے، چاہے یہ جہاد میدان جنگ میں ہو یا امن کے وقت۔

صُلح و جنگ

صلح و جنگ کا موضوع انسانی تہذیب کی تاریخ میں ان قدیم ترین موضوعات میں سے ہے جن پر انسان غور و فکر کرتا ہے۔ صلح پسند لوگ جنگ کی مذمت کرتے رہے ہیں اور جنگ کے حمایتی صلح پسندوں کو بزدلی کا طعنہ دیتے رہے ہیں، لیکن صلح کے وقفے جنگ کی تیاریوں کے وقفے ثابت ہوتے رہے اور جنگ کی تباہ کاریاں انسانوں کو امن و سلامتی کی ضرورت محسوس کرواتی رہی ہیں۔ بعض اوقات حالات اور بزعم خود طاقت ور لوگوں کی چیرہ دستیوں نے انتہا کے صلح پسندوں کو تلوار اٹھانے پر مجبور کیا ہے اور اس طرح حالات نے اور عوامل نے طرازِ اول کے جنگجوؤں کو بامرِ مجبوری صلح کی راہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا ہے انسانی تاریخ ان دونوں مناظر سے بھری پڑی ہے۔

آج کہ میدانِ کربلا میں برپا ہونے والی بے مثال جنگ کی یاد منائی جا رہی ہے، ہم کربلا کے بطلِ عظیم امام حسین علیہ السّلام کے والد گرامی امیرالمومنین حضرت علی علیہ السّلام کے اقوال اسی موضوع کے بارے میں سامعین کرام کے گوش گذار کر رہے ہیں۔

ایک مقام پر حضرت علی علیہ السّلام کا ارشاد ہے: وجدتُ المسالمۃ مالم یکن وھن فی الاسلام انجع من القتال - یعنی میں نے صلح کو جنگ کے مقابلہ میں زیادہ کارآمد پایا جب تک کہ اس سے اسلام پر حرف نہ آئے۔ دوسرے الفاظ میں جناب امیر علیہ السّلام یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ امن و امان اور صلح و صفائی جنگ سے بہتر تو ہے لیکن اگر ایسے امن و امان کی بنا پر اسلام پر حرف آئے تو پھر جنگ کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔

اصل میں مسلمان کی پوری زندگی احکامِ الٰہیہ کے تابع ہوتی ہے۔ جنگ ہو یا صلح، اگر خداوند عالم کے منشا کے مطابق ہے تو درست ہے۔ ہر چند جنگ میں بڑے نقصانات برداشت

کرنا پڑتے ہیں۔ تاہم اگر اس کے بجائے صُلح میں اسلام کے اساسی اقدار پر زد آتی ہو تو پھر جنگ سے مفر کرنا اسلام کو نقصان پہنچانا ہے چونکہ مسلمان کی زندگی کا ہر ہر لمحہ اور ہر ہر عمل خوشنودیٔ خدا کے حصول کے لیے ہوتا ہے اس لیے اس کی جنگ اور صلح بھی اس مقصد کے تحت ہوتی ہے۔ حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنت بھی یہی ہے۔ جنگ بدر میں مسلمان بے سرو سامانی کے عالم میں تھے لیکن حکم رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تحت وہ جنگ آزما ہوئے لیکن صلح حدیبیہ کے موقع پر پوری قوت کی موجودگی کے باوصف ہادیٔ برحقؐ کے حکم سے کفار سے صلح ہوئی اس پر خود مسلمانوں کو تعجب ہوا لیکن وقت گذرنے پر اس کے فوائد ظاہر ہوئے اگر جنگِ بدر کے موقع پر مسلمان جنگ میں شریک نہ ہوتے تو اسلام پر زد پڑتی لیکن صلح حُدیبیہ کے وقت حالات بدل چکے تھے اور اب اسلام اور مسلمانوں کو کوئی خطرہ نہ تھا اس لیے وقتی طور پر جنگ سے گریز کرنا فائدہ مند ثابت ہوا۔

بہادری صرف جنگ کرنے ہی میں نہیں بلکہ طاقت ہونے کے باوجود جنگ نہ کرنا بھی بہادری ہی گنا جاتا ہے۔ البتہ طاقت نہ ہونے کے باوجود جنگ کو دعوت دینا اپنے آپ کو تباہ کرنا ہے اس لیے حضرت علی علیہ السّلام ہی کا ارشاد ہے کہ جو اپنے سے زیادہ طاقت ور کے ساتھ جنگ کرتا ہے وہ مغلوب ہو کر رہتا ہے۔ یہاں جناب امیرؑ کا یہ مطلب نہیں کہ جنگ سے بھاگو بلکہ یہ ہے کہ اس کے لیے تیاری کرو۔ تاکہ مدّ مخالف تم سے زیادہ طاقتور نہ ہو، قرآن مجید بھی اس بات کی ہدایت کرتا ہے کہ اے مسلمانو! اپنی قوت مستحکم کرو۔ اور گھوڑوں کو تیار رکھو تاکہ خدا کے دشمن خوف زدہ رہیں۔

یہ تیاری اس لیے ضروری ہے کہ امن کمزوری کی اساس پر قائم نہیں۔ اگر دشمن کو معلوم ہو کہ مسلمان کمزور ہیں یا جنگ کے لیے تیار نہیں تو وہ موقع سے فائدہ اٹھائیں گے اور پرانی ناکامیوں کا بدلہ لیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم جنگ کے لیے ہمیشہ تیار رہیں کہ حکم خدا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے اس لیے جہاں امیر علیہ السلام امن و صلح جنگ سے بہتر اور

مفید تر قرار دیتے ہیں وہاں یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں۔ رُبَّ حَرْبٍ اَعْوَدُ مِنْ سِلْمٍ • یعنی بعض اوقات جنگ صلح کرنے کے مقابلہ میں زیادہ سود مند ہوتی ہے۔ جنگ کے نقصانات بجا لیکن اگر اصول خطرے میں ہوں اور جنگ ناگزیر ہو جائے تو پھر اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں۔ اس وقت جنگ نہ کرنا بزدلی ہے اور اصولوں کا سودا۔

جناب امیر علیہ السلام کے ان دونوں اقوال کا تقابل کریں تو زندگی میں ایک متوازن رویے کا سراغ ملتا ہے اگر انسان امن و سلامتی کو بالکل نظر انداز کردے اور جنگ کی حمایت پر کمربستہ ہو جائے تو پھر تباہی و بربادی اس کا لازمی نتیجہ ہوگا اور اگر جنگ کی ضرورت کو تسلیم کرنے سے انکار کردے اور ہر حالت میں صلح و صفائی اور امن و سلامتی کو اپنا وطیرہ بنالے تو بھی اس کے لیے تباہی کے سوا اور کچھ نہیں اس کے گرد و پیش کے جنگ پسند اس کا جینا محال کردیں گے۔ اسلام اس قسم کی انتہا پسندی کو رد کرتا ہے۔ مسلمان کا راستہ حدوں کو قبول کرتا ہے۔ وہ خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا پر عمل کرتا ہے اور اسی میں سلامتی کی منزل تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

آج ہم عاشورا کی یاد مناتے ہوئے ان اقوال کی عملی تصویر امام حسین علیہ السلام کے طرز عمل میں دیکھ سکتے ہیں۔ انہوں نے مسلسل اور متواتر کوششیں فرمائیں کہ جنگ نہ ہو، لیکن یزید اور اس کے حاشیہ برداروں نے یہ مطالبہ کیا کہ امام عالی مقام جنگ کے عوض صلح کا راستہ اختیار کرنے کے لیے اسلامی اقدار کا سودا کریں اور یزید کی بیعت کرلیں ایسی صلح میں اسلام کے علم کی سرنگونی لازم آتی تھی آخرکار امام حسین علیہ السلام نے جنگ کو بامر مجبوری اختیار فرمایا اور اسلام کو بچانے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کردیا۔ آج وہ زندہ ہیں اور اہلِ اسلام ان کے اس کارنامے کی یاد اپنے دلوں میں بسائے ہوئے ہیں، اقبال نے سچ کہا ہے۔

نقش الا اللہ بر صحرا نوشت
سطر عنوان نجات ما نوشت

موت کی حقیقت

موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی مفر نہیں۔ انسان اپنی تمام تر کاوشوں کے باوجود موت کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ ہمیں اپنے عزیزوں کی موت پر تکلیف بھی ہوتی ہے اور بعض تکلیف کی یہ ناگن بعض اشخاص کو یوں ڈس لیتی ہے کہ وہ اپنے ہوش و حواس ہی کھو بیٹھتے ہیں۔ عزیزوں کی موت پر رنج کا پیدا ہونا فطری بات ہے لیکن اس رنج کا ہم پر قابو پا لینا اور ہمیں بے حواس کر دینا انسان کے شایانِ شان نہیں کیونکہ یوں معاشرے کا سارا کاروبار متاثر ہوتا ہے اسی لیے ہر انسانی معاشرے میں یہ طریقہ رائج ہے کہ مرنے والے کے عزیز و اقارب کی ڈھارس بندھائی جاتی ہے اور انھیں اس قابل بنانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کا کاروبار جاری رکھ سکیں۔

آج کی اس صحبت میں حضرت علی علیہ السلام کا ایک قول پیش کیا جاتا ہے جس میں انھوں نے اس قسم کے ایک موقع پر مرنے والے کے اعزہ سے خطاب فرمایا ہے فرماتے ہیں۔

إِنَّ هٰذَا الْأَمْرَ لَيْسَ لَكُمْ بَدَأَ وَلَا إِلَيْكُمْ انْتَهَى وَقَدْ كَانَ صَاحِبُكُمْ هٰذَا يُسَافِرُ فَعُدُّوهُ فِي بَعْضِ أَسْفَارِهِ فَإِنْ قَدِمَ عَلَيْكُمْ وَإِلَّا قَدِمْتُمْ عَلَيْهِ۔

اس کا ترجمہ یوں کیا جا سکتا ہے:

کہ یہ بات یعنی موت ایسی چیز نہیں جو تمہارے لیے شروع ہوئی ہو یا تم پر ختم ہو گئی ہو تمہارا یہ عزیز سفر کیا کرتا تھا پس تم اسے سفر کی حالت میں گردانو۔ اگر وہ تمہارے پاس لوٹ کر نہ آیا تو تم اس سے جا ملو گے۔

اس قول میں امام علیہ السلام نے نہایت خوبصورتی سے سوگوار خاندان کو پرسہ دیا ہے اور اس کے ساتھ موت اور حیاتِ دنیوی کا باہمی تعلق واضح کیا ہے۔ وہ موت کو ایک طرح کا سفر قرار دیتے ہیں لیکن اس سفر کا دوسرے سفروں سے فرق یہ ہے کہ اس میں مسافر

لوٹ کر اپنے وطن نہیں آتے بلکہ اہلِ وطن اس سے آملتے ہیں۔ گویا جناب امیر علیہ السلام ہمیں بتا رہے ہیں کہ موت تو ہر شخص کے لیے مقدّر ہے اس سے مفر نہیں۔ آج وہ کل ہماری باری ہے۔ لیکن کسی عزیز کے فوت ہو جانے پر یوں سمجھنا کہ گویا یہ مصیبت صرف ہمیں پر پڑی ہے اور یہ تاثر دینا کہ صرف ہمیں مصیبت زدہ ہیں انسانی معیار کے خلاف ہے۔ اسلام میں موت، زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ زندگی میں ایک تبدیلی ہے اسی لیے ہم موت کو انتقال کرنا یا رحلت کرنا کہتے ہیں۔ موت کے بعد زندگی ایک نیا رُخ اختیار کرتی ہے۔ اس زندگی میں انسان کو اپنے کیئے ہوئے پر عذاب یا ثواب حاصل ہوتا ہے اور پھر یہ بھی ہے۔ ہر شخص کو اس مرحلے سے گذرنا ہے اس لیے اس واقعے کے ہو جانے پر بدحواس ہو جانا کم از کم اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی ہے۔

اسلام میں موت دوسرے ادیان کی مانند ہمیں ختم نہیں کرتی بلکہ ہمارے جسمانی کاموں کو ختم کرتی ہے اور قرآن مجید نے تو مومنوں سے یہ کہا ہے۔ کہ:

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ ۝

یعنی اگر تم سچے ہو تو پھر موت کی تمنّا کرو۔

اس کا سبب یہ ہے کہ اگر ہم زندگیٔ دنیا میں احکام خدا کے مطابق اپنے فرائض سرانجام دیں اور گناہوں سے بچتے رہیں تو پھر ہمیں موت خوف زدہ نہیں کر سکتی۔ موت سے ڈرنے ہی وہ لوگ ہیں جو اس احساس کے حامل ہوں کہ انھوں نے دنیا میں اپنے فرائض درست طور پر ادا نہیں کیۓ یا انھیں مالِ دنیا سے اتنی محبّت ہو تو اس مال کو چھوڑنا ان پر شاق گذرتا ہو یا پھر وہ حیاتِ اخروی پر یقین ہی نہ رکھتے ہوں اور یہ خیال کرتے ہوں کہ موت ان کا آخری خاتمہ ہے اور اس کے بعد کچھ نہیں۔ لیکن اگر انسان اپنی زندگی کو اسلام کے اصولوں کے مطابق ادا کرے تو پھر اُسے موت خوف زدہ نہیں کر سکتی اور نہ کسی اور کی موت انہیں اپنے حواس کھو دینے پر مجبور کر سکتی ہے۔

اس سلسلے میں جناب امیر علیہ السّلام ہی نے ایک بار فرمایا کہ خدا کی قسم مجھے یہ معلوم نہیں کہ جنگ کے دوران میں موت مجھ پر آن پڑتی ہے یا میں موت پر جا پڑتا ہوں مسلمانوں

سے موت سے کھیلنے کے جو نمونے دنیا کو دکھائے ہیں وہ تاریخ میں یادگار ہیں۔ کیونکہ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ:

اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ہ

یعنی میری نماز، میری عبادت، میری زندگی اور میری موت خداوند دو عالم ہی کے لیے ہے۔

وہ زندگی دنیا کو اللہ کی امانت تصوّر کرتا ہے اور جب امانت ادا کرنے کا موقع ہو۔ تو پھر بغیر ہچکچاہٹ کے امانت ادا کر دیتا ہے۔ کربلا کے میدان میں امام حسین علیہ السلام اور ان کے رفقاء نے طلبِ موت کی خواہش کا اظہار جس انداز میں کیا ہے وہ تاریخ میں محفوظ ہے اور مسلمانوں کے لیے زندہ جاوید نمونہ ہے۔

سفرِ آخرت

حضرت امیرالمومنین علی ابنِ ابی طالب کی ذات والا صفات جو تربیت جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مرقع بے مثال ہے، اپنے اندر ایسے مختلف خصائص کا احاطہ کئے ہوئے ہے جو بہت کم لوگوں کو یکجا نصیب ہوتے ہیں۔ ان کی جامع صفات شخصیت ایک طرف اپنے اندر بہترین جسمانی صفات شائستہ کو لیئے ہوئے تھی اور دوسری جانب روشن ترین روحانی کمالات کا مظہر تھی وہ بیک وقت اشجع الناس بھی تھے اور اعلم العصر بھی۔ ان کی بہادری اور دلیری کی داستانوں نے اپنوں اور غیروں سے اپنا لوہا منوایا ہے اور ان کے علم وفضل نے انسانوں کو انگشت بدنداں کیا ہے۔ اقبال نے مردِ مومن کے بارے میں کہا ہے:

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت اس کا کامل نمونہ نظر آتی ہے۔ قرآن مجید نے حضرت طالوت علیہ السلام کی تعریف میں بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ کے الفاظ استعمال کئے ہیں ان الفاظ کو ذاتِ علوی سے معنی اور روشنی ملتی ہے۔ بدر و احد و خندق و خیبر و حنین ان کے جسمانی کمالات کا مظہر ہیں اور نہج البلاغہ ان کے علمی طاقات کا مرقع ہے ان کے خطبات کا تو ذکر ہی کیا، ان کے مختصر ترین اقوال بھی انسانی زندگی کے تجارب کا نچوڑ اور حکمتِ الٰہیہ کا آئینہ پیش کرتے ہیں۔ آج کی اس صحبت میں جناب امیرالمومنین علیہ السلام کا ایک مختصر سا قول اسی بات کی وضاحت کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔

جناب امیر علیہ السلام فرماتے ہیں: "مَنْ تَذَكَّرَ بُعْدَ السَّفَرِ اِسْتَعَدَّ" یعنی جس شخص کو اپنے سفر کی طوالت یاد ہو وہ اس کے لیے تیاری کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر سفر کرنے والے کو یہ احساس ہو کہ اسے بہت فاصلہ تیار کرنا ہے تو وہ اس کی مناسبت سے تیاری کرتا ہے تاکہ دورانِ سفر میں اسے تکلیف نہ ہو اور پریشان نہ ہونا پڑے لیکن وہ شخص جو بغیر

تیاری کے سفر پہ نکل کھڑا ہو یا اسے شناکل سفر کا شعور نہ ہو تو راستے کی ٹھوکریں کھانا اس کا مقدر ہوتا ہے اور منزل تک اس کی رسائی ناممکن ہوتی ہے اگر سفر کو محدود معنوں میں لیا جائے یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرنے کے مفہوم میں، تو بھی یہ قول صادق ہے اور اس میں زندگی کے تجربات کا نچوڑ اور عقل کے استعمال کا سراغ ملتا ہے لیکن بات صرف یہیں پہ ختم نہیں ہو جاتی . بلکہ سفر کے لفظ کو وسیع تر معانی میں استعمال کرنے سے اس قول کے ذریعے سے ہمیں کچھ اور روشنی ملتی ہے ۔ سفر کے وصفی معنی تو بیان ہو ہی چکے ہیں یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا لیکن زبان میں سفر صرف اسی بات کا نام نہیں بلکہ ہر وہ عمل میں مادی یا غیر مادی حرکت لازم آئے سفر کہلاتا ہے اسی لیے اقبال نے ہر شے کو مسافر کہا ہے ۔ سفر تو پوری زندگی پہ حاوی ہے ہر عمل چاہے مادی ہو یا غیر مادی، انفرادی ہو یا اجتماعی، سیاسی ہو یا معاشرتی، علمی ہو یا ادبی ایک قسم کا سفر ہوتا ہے ۔ مشہور مسلمان فلسفی صدرالدین شیرازی نے اپنے فلسفے پر مبنی ایک کتاب کا نام اسی بنا پر "اسفار" رکھا ہے ۔ جب کوئی فرد یا قوم ترقی کی راہیں طے کرنا چاہیں تو انہیں سفر ہی کرنا پڑتا ہے ۔ اسلام نے موت کا جو فلسفہ اپنے ماننے والوں کے سامنے پیش کیا ہے اس میں موت زندگی کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ آخرت کا سفر ہے ۔ مسلمان مرتا نہیں اپنے پالنے والے کی جانب لوٹ جاتا ہے ۔ اس اعتبار سے پوری زندگی ایک نہیں بہت سے سفروں کا مجموعہ ہے ۔ ہمارے شعراء نے بھی سفر کو ان معنوں میں استعمال کیا ہے ۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو جناب امیر المومنین علیہ السلام کا یہ مختصر سا قول ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار کرتا ہے اور یہ سمجھاتا ہے کہ اگر ہم زندگی میں جمود اور سکون کا شکار نہیں ہونا چاہتے اور اسی حالت میں اس دنیا سے جانا پسند نہیں کرتے جس حالت میں ہم یہاں وارد ہوئے تھے تو پھر ہمیں حرکت کا اصول اپنانا پڑے گا جس کے بغیر برکت نصیب نہیں ہو سکتی ۔ گویا ہمیں بامقصد سفر کرنا ہو گا ۔ یہ حرکت انفرادی یا اجتماعی فاصلہ دونوں میں طے ہو گا اور اس مسافت کو طے کرنے کے لیے تیاری لازم ہے، وہ افراد یا وہ اقوام جو سفر کی خواہش تو رکھیں لیکن اس کے لیے تیار نہ ہوں ۔ سفر طے کرنا تو درکنار پہلا قدم اٹھانے کے قابل نہیں ہو پاتے محرومی یا مایوسی ان کا مقدر ہوتی ہے ۔ اور ان کی تمام

زندگی رجعت قہقری کی مصداق، صرف اچھے خواب دیکھنے سے بات نہیں بنتی ان خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے کام کرنا پڑتا ہے خداوندِ عالم نے بھی اس طرف ہمیں ہدایت فرمائی ہے کہ: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (یعنی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے آپ کو نہ بدلیں) اس لحاظ سے ہر قسم کی ترقی سفر کی محتاج ہے اور سفر کی کامیابی کا انحصار تیاری پر ہے۔

اس قول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب معمولی قسم کے دنیاوی سفروں کے لیے ہمیں تیاری لازم ہے اور زاد راہ درکار ہے تو سفرِ آخرت کہ تمام سفروں سے زیادہ طولانی اور مشکل ہے، کس قدر تیاری اور زادِ راہ کا تقاضا کرتا ہے۔ مسلمان اس سفر کے لیے تیاری احکام خدا و سنت محمدیہ پر عمل پیرا ہونا ہے اور اعمال صالحہ کا زادِ راہ جمع کرنا ہے۔ قرآنِ مجید نے صرف اسی قسم کی تیاری اور ایسے زادِ راہ جمع کرنے والوں کو گھاٹے کے سودے سے مستثنیٰ قرار دیا ہے اور سورۂ العصر اس کی دلیل ہے۔

جناب امیر علیہ السلام کا یہ قول نہ صرف انسانی عقل کے تقاضوں کا آئینہ دار ہے بلکہ تعلیماتِ قرآنیہ اور ارشادات نبویہ کا مظہر بھی ہے۔

[illegible]

[illegible]